مارچ ۱۹۹۳ء

ماہنامہ

حیاتِ نو

انجمن طلبۂ قدیم

ANJUMAN TALBA-E-QADEEM

BILARIAGANJ-AZAMGARH(U.P.) INDIA

مجلس ادارت

شبیر احمد فلاحی	مرکز دھلی
نسیم احمد غازی فلاحی	مرکز دھلی
عبید اللہ فہد فلاحی	علی گڑھ
اشتیاق احمد فلاحی	علی گڑھ
عبدالحیّ فلاحی	دعوت دہلی
شفیق عالم رانچوی	رانچی
اطہر ریحان فلاحی	الجبیل (عرب)

ماہنامہ

حیات نو

مدیر مسئول ——— نور محمد فلاحی

مدیر معاون ——— سید راشد علی حامدی

جلد ——— ۴	جمادی الآخر ۱۴۰۳ھ مطابق مارچ ۱۹۸۳ء	شمارہ ——— ۱۲

سالانہ ۲۰ روپیہ — قیمت فی شمارہ ۲ روپیہ

نقوش حیات نو

دھڑکنیں	آسام میں قتل عام	سید راشد علی حامدی
بارگاہ یزدی سے	احتساب وجائزہ	مولانا ابوبکر اصلاحی
فکر وخیال	اقبال پر ترچھی نظر	خسرو رفیع احمد
	اسلامی انقلاب اور تعلیم	ابن عبادت فلاحی
	قصۂ پارینہ	مولانا عبدالحکیم ایم۔اے
	ستاروں پر جو ڈالتے ہیں کمند	مجیب اللہ خاں
	معروف ومنکر	ابوسفیان اصلاحی
	سب سے بڑا فن	شفیق طاہری
	عہد حاضر میں ہماری ذمہ داری	احسن اقبال
	علم جدید کا چیلنج اور مسلم طلبہ کی ذمہ داریاں	مجاہد الاسلام
	محسن اعظم	ابوالمجاہد زاہد
شعر ونغمہ	غزل	شفیق طاہری
	غزل	حفیظ میرٹھی
تبصرے تجزیے	نقد وتبصرہ	مولانا عبدالحکیم ایم۔اے
	جامعہ کے لیل ونہار	محمد سمیع اختر

دھڑکنیں

آسام میں قتل عام

منظر پس منظر

سید راشد علی حامدی

آج ہمارے ملک کی سیاسی فضا ایک بار پھر دھماکوں سے لرزہ خیز ہے۔ آسام کے حالیہ صوبائی انتخابات کے وقت جو کچھ ہوا وہ موجب تشویش ہی نہیں باعث ننگ و عار بھی ہے۔ آسام میں وقوع پذیر ہونے والے حادثات یہ بیان کرنے کیلئے کافی ہیں کہ ملک میں جمہوری طاقتیں کسقدر ناکام ہیں۔ آسام میں سیاسی جماعتوں کی تائید و حمایت سے ہزاروں قبائلیوں نے، جس میں سیاسی غنڈے بھی شامل تھے، جس طرح مسلم اقلیت کے گاؤں پر حملہ کیا اور ان کی جان و مال اور عزت و آبرو سے ہولی کھیلی اگر یہ کہا جائے کہ اس حادثہ نے صابرہ اور شتیلہ کیمپوں میں کئے گئے ظلم و ستم کو مات کر دیا تو بے جا نہ ہوگا کیوں کہ صابرہ اور شتیلہ کیمپوں میں نہ تو مکانوں کو نذر آتش کیا گیا تھا اور نہ اتنے وسیع پیمانے پر جانی و مالی نقصان ہوا تھا۔

لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ غیر ملکیوں کے مسئلہ پر جو تحریک تین سال پہلے شروع کی گئی تھی وہ آخر فرقہ واریت میں کیسے تبدیل ہو گئی کیونکہ غیر ملکیوں میں ہندو مسلم کی کوئی قید نہ تھی بلکہ اس کی زد دونوں گروہوں پر یکساں پڑ رہی تھی۔

دراصل اس مسئلے میں حکومت نے یہ حکمت عملی اپنائی کہ وہ اس مسئلہ کو جتنا طول دے سکے دے، تاکہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے اور یہ تحریک اپنی موت آپ مر جائے کیوں کہ اس مسئلہ کا منصفانہ حل اس بات کا مترادف تھا کہ آسام سے حکمراں جماعت کے اثرات بالکلیہ ختم ہو جائیں اور یہ علاقہ مرکز سے کٹ کر رہ جائے جس کا نہ صرف حکومت کا نقصان تھا بلکہ ملک کی سالمیت کو بھی خطرہ در پیش تھا لیکن حکومت کی یہ حکمت عملی اس کے اندازوں کے برعکس اس کے تمام منصوبوں پر پانی پھیر گئی اور وہ اقلیت کو تحفظ دینے میں ناکام رہ گئی کیوں کہ اس حکمت عملی کے نتیجہ میں تخریبی جماعتوں اور سماج دشمن عناصر کو کھلی چھوٹ مل گئی کہ وہ اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ اس درمیان حکومت نے کچھ ایسے عملی اقدامات کئے جس سے یہ تحریک آہستہ آہستہ [illegible] اختیار کرتی گئی کیوں کہ اس عرصہ میں تعمیری اور مثبت انداز فکر کی حامل جماعتوں اور محب وطن افراد کو اپنا کردار ادا کرنے کا موقع نہ مل سکا بلکہ وہ ایک طرح سے بے بس کر دیئے گئے تھے لیکن دوسری طرف تخریبی عناصر نے اپنی زیر زمین سرگرمیاں (under ground activities) جاری رکھیں اور وقتاً فوقتاً تخریب و تشدد کے مظاہرے بھی کرتے رہے اس لئے اس تحریک کو پھیلنے پھولنے اور فرقہ وارانہ رنگ اختیار

کرنے کے کافی مواقع ہاتھ آئے اور ایک وقت وہ آیا کہ یہ توڑ پھوڑ اور تخریبی عمل مختلف شکلوں میں آگے بڑھتا ہوا ایک ایسے موڑ پر آگیا جہاں سے واپسی تقریباً ناممکن ہوگئی۔ اگر حکومت نے نقطۂ آغاز ہی میں اس تحریک کو دبانے کے لئے فوری اقدامات کئے ہوتے تو حالات اس قدر سنگین صورت اختیار نہ کرتے لیکن حکومت نے اپنے وقتی مفادات کی خاطر اس مسئلے سے گریز اور فرار کی راہ اپنائی۔

اس نقطہ پر پہونچ کر اس مسئلہ نے ایسی نوعیت اختیار کی کہ حکومت کے بھی ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔ صورتحال کی سنگینی اور نزاکت نے حکمراں جماعت کو مجبور کردیا کہ وہ کچھ وقتی اور عارضی تدابیر اختیار کریں چنانچہ حکومت نے آسام میں نافذ صدر راج کو ختم کرکے فوری انتخابات کا اعلان کردیا اور اپوزیشن کی شدید مخالفت کے باوجود کہ موجودہ کشیدگی کی فضا میں انتخابات کے برے اثرات مرتب ہوں گے، وہ اپنے فیصلہ پر قائم رہی۔

چنانچہ جب انتخابات شروع ہوئے تو ایک طرف تو ایجیٹیشن نے اس کا بائیکاٹ کیا تو دوسری طرف سرکاری ملازمین نے بھی اس انتخابی مہم میں حصہ لینے سے انکار کردیا لیکن حکومت کی عقل پر پردے پڑ چکے تھے اس نے دوسرے علاقوں سے تقریباً ڈیڑھ لاکھ ملازمین، پولس اور فوج سارا کا سارا جھونک دیئے جس نے جلتی پر تیل کا سا کام کیا۔ اور پورے آسام میں فرقہ واریت کی آگ بھڑک اٹھی۔ ان کو حکومت سے کچھ بن نہ پڑی تو انھوں نے سارا غصہ مسلمانوں پر اتارا اور پھر وہاں مسلم اقلیت کے ساتھ وہ سب کچھ ہوا جس سے جسم و جان پر لرزہ طاری ہوتا ہے۔

میں بہت ہی غم اور افسوس کے ساتھ یہ سطور لکھ رہا ہوں کہ یہ سرزمین جو امن و شانتی، نانک و چشتی اور گاندھی و آزاد کی سرزمین تھی جو انسان نواز مردوں اور مرد صفت انسانوں کا گہوارہ رہی ہے جہاں رام نے پریم کی بانسری بجائی تھی، جہاں نانک نے اتحاد و یکجہتی کا پیغام دیا تھا، جہاں چشتی نے نعرۂ حق بلند کیا تھا، جہاں گاندھی نے اہنسا اور عدم تشدد کا درس دیا تھا آج وہی سرزمین ظلم و بربریت، ظلمت و تاریکی اور درندگی میں اپنی مثال آپ ہے، یہی ملک جو ہمیشہ سے امن و آشتی کا گہوارہ تھا آج فرقہ واریت اور لاقانونیت کے شعلوں سے دہک رہا ہے۔

ہماری نگاہ میں یہ واقعہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ہندوستان کا سب سے سنگین واقعہ ہے، آسام میں جو کچھ ہوا اگر اس کے تدارک کی فوری کوشش نہ کی گئی اور اشتعال اور تصادم کی فضا ختم کرنے کی تدابیر نہ کی گئیں تو کیا امید کی جاسکتی ہے کہ دوسرے صوبوں میں وہی کچھ نہ ہوگا جو آسام میں ہوا جیسا کہ بنگال کے وزیر اعلیٰ جیوتی باسو نے آسام میں بنگالیوں پر کئے گئے ظلم و ستم کو دیکھ کر ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ آسام میں بنگالیوں کے ساتھ جو کچھ ہوا بنگال ہرگز اس سے غیر متعلق نہیں رہ سکتے اس کا صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ بنگالیوں پر کئے گئے ظلم و ستم کا جواب بنگال سے دینے کی کوشش کی جائے گی پھر کیا ہوگا اس کا جواب براہ کرم ہم سے نہ پوچھئے۔

اس واقعہ پر بعض اخبارات نے حکومت کو مجرم قرار دیا ہے اور بعض نے اپوزیشن کو الزام کے کٹہرے میں کھڑا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ہماری نگاہ میں نہ تو تنہا حکومت ذمہ دار ہے اور نہ اپوزیشن۔

حقیقت واقعہ یہ ہے کہ جو لوگ حالات و واقعات کو اس کے پس منظر، اس کے ماضی اور اس کے سیاق و سباق سے الگ کرکے دیکھتے اور کوئی نتیجہ اخذ کرتے ہیں وہ درحقیقت ملک و قوم کو فریب دیتے ہیں۔

آیئے اب ہم ان حالات کا تجزیہ اس کے صحیح پس منظر، سیاق و سباق اور ماضی و مستقبل کو سامنے رکھ کر کریں اور

اس مشکل دشوار صورتحال کے اسباب و وجوہ کا پتہ لگائیں

ہم نے جب انگریزوں کے خلاف جنگ شروع کی تھی تو ہمارا ایک ہی مقصد تھا یعنی آزادی خواہ وہ کیسے ہی ملے اور اس مقصد کے لئے پورا ملک اتحاد و یکجہتی کا نمونہ بن گیا تھا، تمام اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر، تمام رنجشوں کو بھلا کر سب ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوگئے تھے اور سب نے متحد ہو کر آواز میں آواز ملا کر ایک ہی راگ الاپا تھا آزادی، آزادی۔

لیکن جب بے مثال قربانیوں، جانفشانیوں اور جاں سپاریوں کے بعد ملک آزاد ہوا تو ایک طرف تو تقسیم ہند کا حادثہ پیش آیا جس نے دونوں گروہوں کے جذبات مشتعل کر دیئے۔ ملک کو موجودہ صورت حال تک پہونچانے میں اس حادثہ کا بڑا کردار رہا تو دوسری طرف آزادی جو پورے ملک کا مشترکہ مقصد تھا، حاصل ہوگیا تو اتحاد کا شیرازہ منتشر ہوگیا، اور اب چونکہ دوسرا کوئی ایسا مقصد نہ تھا جو ان کو ایک لڑی میں پروئے رکھتا۔ اس لئے ملک کا ہر طبقہ اور ہر علاقہ "اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ" کا مکمل مصداق بن گیا اور ہر طبقہ اور ہر علاقہ اپنے اپنے حقوق کے مطالبہ میں سرگرم ہوگیا اور یہی وجہ ہے کہ ہمارا ملک ۲۵ سالوں سے علاقائی کشمکش کی آماجگاہ بنا ہوا ہے اور ہر علاقہ کوئی زبان کی بنیاد پر کوئی کلچر کی بنیاد پر مرکز کو اس قسم کی دھمکیاں دیتا نظر آتا ہے کہ اگر اس کے یہ مطالبات (خواہ وہ جائز ہوں یا ناجائز) منظور نہ کئے گئے تو مرکز سے علیحدگی کی تحریک چلائے گا۔

اس حقیقت کو شاید راجندر پرشاد نے بہت پہلے بھانپ لیا تھا چنانچہ ایک تقریر کے دوران انہوں نے ہندوستان کے اتحاد و یکجہتی کو سراہتے ہوئے کہا تھا کہ جس طرح ایک ہار میں مختلف قسم کے موتی اور جواہرات ہوتے ہیں اگرچہ ان میں سے ہر ایک کی اپنی ایک حیثیت اور قیمت ہوتی ہے لیکن یہی موتی اور جواہرات ایک ہار کی شکل اختیار کرتے ہیں تو انمول ہوجاتے ہیں۔"

آج ہمارے ملک کو کسی نئے چیلنج کا سامنا نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی قوم کی ترقی اور ارتقا کی راہ نشیب و فراز ہو کر گزرتی ہے جس کا اس ملک کے تضادات سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اگر ہم اپنے ملک کو تاریخی پس منظر میں دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ملک کو سے بھی شدید چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑا ہے لیکن ہم نے ان چیلنجوں کا دنداں شکن جواب دیا ہے، ہم نے اپنے ملک کیلئے بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں اگر ہم وسعت قلب و نظر کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے مفادات کو ملکی مفادات کے تابع کر دیں تو سارے مسائل خود بخود حل ہو جائیں۔ امریکہ کے صدر جان کینیڈی کی قبر کے پر جو عبارت کندہ ہے اس کا ایک ایک لفظ نہ صرف آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے بلکہ وہ ہمارے لئے دعوت فکر بھی ہے۔

"Think not for America can
o you, Think what you can do
or America."

یہ ایک مثبت انداز فکر ہے، یہ سوچنا بالکل غلط ہے کہ ملک سے کیا حاصل کر سکتے ہیں، ملک ہمیں کیا دے سکتا ہے بلکہ ہمارا نقطہ نظر یوں ہو کہ ملک کو ہم کیا دے سکتے ہیں تو ہمارا ملک دوبارہ اتحاد و وحدت کا بے مثل نمونہ بن سکتا ہے اور سارے ذاتی اختلافات اور عارضی و وقتی مفادات ملک کے عظیم اور تر مفادات پر قربان کئے جا سکتے ہیں

اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ مرض کی صحیح تشخیص جائے اور اس بے مقصدیت، لاقانونیت، علاقائیت اور فرقہ کے خاتمہ کے لئے ہر ممکن تدابیر اختیار کی جائیں۔ ملک کی اس اور ہر لحظہ رنگ بدلتی ہوئی صورتحال میں ملک کے تمام سیاسی غیر سیاسی رہنماؤں کا یہ فرض منصبی ہے خواہ ان کا تعلق حکمران پارٹی سے ہو یا اپوزیشن سے کہ اس مسئلہ کا کوئی حل تلاش کر ورنہ ملک کی سالمیت خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ ! !

بارگاہ خداوندی سے

مولانا ابوبکر اصلاحی
استاذ جامعۃ الفلاح

احتساب و جائزہ

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُونَ ۝
(انبیاء : ۱)

ترجمہ: لوگوں کے لئے ان کے محاسبہ کا وقت قریب آ لگا ہے اور وہ غفلت میں پڑے ہوئے اعراض کئے جا رہے ہیں۔

رفقائے کرام و معزز حاضرین! مجھے پوری توقع ہے کہ آپ حضرات دنیا کے حالات سے کسی قدر واقفیت رکھتے ہوں گے۔ مسائل کے انبار اور حالات کی ابتری پر میں کچھ لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ مجھے تو آپ حضرات سے صرف یہ کہنا ہے کہ ان حالات میں آپ کو اپنا پورا پورا جائزہ لیتے رہنا چاہئے کہ آپ اپنے عزیز اوقات کو کن کاموں میں صرف کر رہے ہیں جب کہ آپ کا دعویٰ یہ ہے اور اس سے سچا دعویٰ اور کیا ہو سکتا ہے، کہ موجودہ مسائل کا حل اور حالات کے سدھار کا نسخہ اکسیر آپ کے پاس ہے۔ بے کار کاموں کے لئے تو ہمیشہ سے انسانوں کی مدت کم ہی رہا کرتی ہے لیکن ہمارے لئے تو وقت کا ایک ایک لمحہ بھی عزیز ہے۔ مت بھولئے یہ زندگی جو خالق کائنات کی طرف سے عطا ہوئی ہے کیا یہ اس کا احسان اور اس کی آخری نعمت نہیں؟ پھر اگر ہم نے اس کا ایک لمحہ بھی ضائع کیا تو ذرا یہ سوچ لیجئے جس دن خدائے حی و قیوم کے سامنے حاضر کئے جائیں گے اور ایک ایک نعمت کے بارے میں سوال ہوگا۔

ثُمَّ لَتُسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ ۝ پھر اس دن تم سے نعمتوں کے بارے میں پوچھ گچھ ہوگی۔

تو اس وقت ہمارا کیا جواب ہوگا؟ دنیا کا ایک ایک ذرہ اللہ کے احاطۂ علم میں ہے کما قال تعالیٰ

مَا يَخْفَى عَلَى اللَّهِ مِن شَيْءٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ

آسمانوں و زمین میں کوئی چیز بھی اس کے علم سے مخفی نہیں۔ اور انسان بھی اس کے وسعت علم سے باہر نہیں بلکہ انسان سے قریب تر کوئی ہے تو وہ اسی کی ذات ہے

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ ۝

اور ہم نے انسان کو پیدا کیا اور اس کے جی میں جو خیالات آتے ہیں ہم ان کو جانتے ہیں اور ہم اس کی رگ گردن سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ اس سب کے باوجود صرف حجت تمام کرنے کیلئے ہمیں کاتبانِ اعمال کی خبر دی گئی ہے۔

إِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيَانِ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيدٌ ۝ مَا يَلْفِظُ مِن قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ (ق ۱۷، ۱۸)

جب دائیں اور بائیں بیٹھے ہوئے دو لینے والے لیتے جاتے ہیں وہ کوئی بات منہ سے نہیں کہتا مگر اس کے پاس ایک نگہبان تیار رہتا ہے جس کا نوشتہ قیامت کے دن پیش ہوگا۔

وَقَالَ قَرِينُهُ هَٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيدٌ ۝ (ق ۲۳)

اور اس کا ہم نشین کہے گا کہ یہ اعمال نامہ ہے جو میرے پاس تیار حاضر ہے۔

اور پھر کہا جائے گا کہ

اِقْرَأْ كِتَابَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا

اپنا اعمال نامہ پڑھ لے آج تو خود اپنا آپ ہی محاسب کافی ہے۔

تو قبل اس کے کہ وہ دن آئے اور

يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ — جس دن کچھ چہرے سفید ہوں گے اور کچھ چہرے سیاہ اور اترے ہوئے۔ اور

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ — بہت سے چہرے اس دن روشن خنداں اور شاداں ہوں گے اور بہت سے ایسے ہوں گے جن پر گرد و غبار پڑا ہوگا جن پر سیاہی چھائی ہوگی۔

اس وقت کا منظر آنکھوں کے سامنے ہو۔ ہم آج ہی کیوں نہ اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہیں کہ

اِقْرَأْ كِتَابَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا

اس لئے کہ ہم اپنے حالات سے بخوبی واقف ہیں پھر اپنے سے اچھا محاسب کون ہو سکتا ہے اور پھر یہی وقت ہے کہ اگر اس وقت ہم اپنے احتساب اعمال کی طرف متوجہ ہو گئے تو اس کا پورا پورا فائدہ حاصل کر سکتے ہیں عقل مند وہی ہے جو اس دن کے آنے سے پہلے باخبر رہا ہو جس میں اس کے آرام و آسائش کا کیا ٹھکانا

وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ فَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِيَهْ وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ — اور جس کا نامہ اعمال اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا وہ کہے گا کہ کیا اچھا ہوتا کہ مجھ کو میرا نامہ اعمال ہی نہ ملتا اور مجھے یہی خبر نہ ہوتی کہ حساب کیا ہے؟

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَيَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ اِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنِّيْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ — پھر جس شخص کا نامہ اعمال داہنے ہاتھ میں دیا جائیگا وہ کہے گا کہ یہ لو میرا نامہ اعمال پڑھ لو مجھے تو پہلے ہی سے یقین تھا کہ میرا حساب پیش ہوگا

اسے دلاسہ کیا دو لیکن پر وہ عالی شان بہشت میں جگہ کیا ہوگا۔

لیکن جو یہاں غافل رہے گا اسے ظاہر ہے حسرت و ندامت سے دوچار ہونا پڑے گا

معزز رفقاء! خدا کا شکر ہے کہ ہمارے یہاں اور دوسری طرح زندگی کی کوئی تقسیم نہیں ہے کہ جہاں تک عبادت کا تعلق ہے اس میں دین کی پیروی کریں اور سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی کو اس کی اطاعت سے بالکل خارج کر لیں بلکہ ہمارا تو ایمان ہے کہ مکمل دین کے اختیار کرنے ہی میں دنیا اور آخرت کی کامیابی ہے اور اسی بات کا مطالبہ اس آیت کریمہ میں کیا گیا کہ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً — اے مومنو! پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ۔

مگر میں آپ کو متنبہ کئے دیتا ہوں کہ شیطان جو کہ ہمارا آپ کا اور تمام بنی آدم کا ازلی دشمن ہے اس کے بہکانے کے بھی مختلف اور نوع بنوع طریقے ہیں

اگر ہمارے وہ مشاغل جن کو ہم نے اختیار کیا ہے خواہ وہ کھیتی ہو یا تجارت ہو . . . یا ملازمت ہو ہمارے نزدیک اصل اور مقدم ہیں اور اقامت دین جسے درحقیقت مقصود اصلی ہونا چاہئے وہ ثانوی حیثیت رکھتا ہے کہ ان مشاغل سے فرصت کے دو چار گھنٹے اگر حاصل ہو جائیں تو اقامت دین کا کام بھی کر لیا جائے ورنہ اس کام کیلئے وقت نہ دے سکنے کیلئے یہ بہانہ کافی سمجھ لیا جائے کہ ضروری مشاغل سے فرصت نہ مل سکی تو یقین مانئے کہ یہ بھی زندگی کی ایک تقسیم ہے ایسی اصول کی تقسیم جس کی تقسیم نہیں ہو سکتی اسلام بھی اس تقسیم کو گوارہ نہیں کرتا بلکہ اسے اقامت دین ہی کا کام اصل ہے باقی سارے کام فرع کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہر عقل مند انسان فرع پر اصل کو مقدم رکھے گا لیکن اگر آپ کے نزدیک اپنے ہی مشاغل زیادہ اہم اور زیادہ محبوب ہیں تو خالق کائنات کا فرمان بھی سن رکھئے کہ:

قُلْ إِن كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ
وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ
وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ
كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا
أَحَبَّ إِلَيْكُم مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ
وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا
حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ وَاللَّهُ
لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ؕ

کہہ دو اے نبیؐ اگر تمہارے باپ اور بیٹے، تمہارے بھائی اور بیویاں اور تمہارے قرابت دار اور وہ مال جسے تم نے کمایا ہے اور وہ سوداگری جس کے مندے ہونے کا تمہیں اندیشہ ہے اور وہ مکانات جنہیں تم پسند کرتے ہو، تمہیں اللہ اور رسول اور جہاد فی سبیل اللہ سے زیادہ محبوب ہیں تو تم منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم بھیجے اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

رفقائے کرام! ہماری ایک چھوٹی سی لغزش بھی بہت بڑے نقصان کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے اس لئے ہمیں چاہئے کہ ہم اپنی حرکات کا جائزہ لیتے رہیں۔ لوگوں کی اپنی بہت سی حرکات سے لاپرواہی اور انہیں حقیر جاننے ہی کی وجہ سے حضرت انسؓ بے چین ہو گئے تھے اور اسی بے چینی ہی نے تابعین کے سامنے انہیں یہ کہنے پر مجبور کیا تھا جسے امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے کہ

إنكم لتعملون أعمالا هي أدق في أعينكم من الشعر كنا نعدها على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم من الموبقات۔

تم بہت سے اعمال ایسے کرتے ہو جو تمہاری نظروں میں بال سے زیادہ باریک اور حقیر ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہم انہیں مہلک اور تباہ کن سمجھتے تھے۔

اور کیوں نہ بے چین ہو جاتے جبکہ ان کے سامنے رحمۃ للعالمینؐ کا یہ ارشاد تھا کہ،

من حسن الإسلام المرء تركه ما لا يعنيه۔

بہترین مسلم وہ ہے جو لغویات کو ترک کر دے۔

اب ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو سامنے رکھتے ہوئے کہ:

واتق الله حيثما كنت وأتبع السيئة الحسنة تمحها وخالق الناس بخلق حسن

جہاں کہیں بھی ہو اللہ سے ڈرو اور لغزش کے بعد فوراً اچھے کام کی طرف متوجہ ہو جاؤ جو اس کے اثر کو زائل کر دیتا ہے۔

اپنا جائزہ لینا چاہئے اور کوئی بھی غلطی ہو اس سے ہٹ کر فوراً اچھے کاموں میں لگ جانا چاہئے۔ خدا ہم کو اور آپ کو نیک عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

حیاتِ نو
کا
★ شخصیات نمبر ★

دیدہ زیب ٹائٹل، عمدہ کتابت، ونڈانک کی طباعت، نادر معلومات سے مملو بہت ہی قلیل تعداد میں موجود ہیں اس کے علاوہ "مجدد مودودی نمبر" کے بھی چند نسخے موجود ہیں علمی شغف رکھنے والے حضرات ان نادر اور تاریخی دستاویزات کے حصول کیلئے دفتر سے رابطہ قائم کریں۔

قیمت غیر مجلد ۱۰ روپئے۔

نوٹ :- آدھا ڈاک خرچ ادارے کے ذمہ ہوگا

اسلامی انقلاب اور تعلیم

عبید اللہ فہد فلاحی

احیائے اسلام کا دور

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ یہ دور احیائے اسلام، انقلابِ اسلامی اور تحریکاتِ اسلامی کا دور ہے۔ آج زندگی کے ہر میدان میں غیر اسلامی افکار و نظریات ٹوٹ پھوٹ رہے ہیں۔ ایک وقت تھا جب علی الاعلان یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ،

"جس طرح ایٹم کے ٹوٹنے سے مادہ کے بارے میں پچھلے تمام تصورات ختم ہو گئے اسی طرح گذشتہ صدی میں علم کی جو ترقی ہوئی ہے وہ بھی ایک قسم کا علمی دھماکہ ہے جس کے بعد خدا اور مذہب کے متعلق تمام پچھلے خیالات بھک سے اڑ گئے ہیں"۔ (جولین ہکسلے)

لیکن اب قرآن کو جدید سائنس کا علم کلام ثابت کیا جا رہا ہے۔ ایک وقت تھا جب اشتراکیت کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا اس کے لادینی تصورات سارے عالم پر حکمرانی کر رہے تھے۔ اس کی سیاسی و فوجی طاقتیں اپنی مکاری اور چالاکی سے ساری دنیا کو اپنا غلام بنا رہی تھیں لیکن آج پولینڈ میں اسے منہ کی کھانی پڑی ہے افغانستان میں بے یار و مددگار مسلمانوں نے اس کا سرِ پُر غرور خاک میں ملا دیا اور اب وہ "نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن" کا مصداق بن چکا ہے۔ ایک مغربی مبصر کے الفاظ میں افغانستان روس کے گلے میں ہچکولہ بن گیا ہے جو نہ نگلتے بن رہی ہے اور نہ اگلتے بن رہی ہے۔

آج زندگی کے ہر میدان میں وہ قدیم و جدید جاہلیت سے کشمکش کر رہا ہے اور زندگی کے ہر محاذ پر برسرِ پیکار ہے۔ کہیں فتح سے ہمکنار ہو رہا ہے اور کہیں چوٹ کھا کر گہرے زخم مندمل کر رہا ہے بہرحال ایک ایسی لہر چل پڑی ہے جسے کوئی روک نہیں سکتا۔ ہمارے اپنے ملک میں غیر مسلم طبقہ کا ہزاروں کی تعداد میں اسلام کی آغوش میں آنا تحریکِ اسلامی کے مستقبل کی نشاندہی کرتا ہے۔

تعلیم کا رول

یوں تو احیائے اسلام کی اس تحریک کو مختلف محاذوں اور میدانوں میں پیش قدمی کرنی ہے لیکن ایک مغربی مصنف کے الفاظ میں احیائے اسلام کی اس تحریک کے جس کو وہ خود MILITAN ISLAM متعصب اسلام کے نام سے یاد کرتا ہے۔

"اصل میدانِ جنگ اسکول کا وہ کمرہ ہے جہاں سے اپنی فکر اور اپنی روح کی بازیابی کا معرکہ درپیش ہے۔ بظاہر ایسے غیر معمولی کام جیسے نئی کتابوں کی تیاری، نئے نصاب کی تدوین، اساتذہ کی تربیت بالآخر شاید ان جنگوں سے زیادہ اہم اور دیرپا اثرات کے حامل ثابت ہوں جو کہ گلیوں اور سڑکوں پر لڑی جا رہی ہیں۔"

یہ ہے احیائے اسلام کی جدوجہد میں نظامِ تعلیم کی وہ اہمیت

جو کسی کی نگاہوں سے بھی پوشیدہ نہیں۔ اور جس کے پیش نظر آج میں آپ کو اپنے خیالات میں شریک کرنا چاہتا ہوں۔

اسلام کی نگاہ میں تعلیم کی اہمیت

اسلام میں علم و حکمت

کو جو اہمیت ہے اور اس کے حصول پر جو زور دیا گیا ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جو پہلی وحی نازل ہوئی وہ تعلیم سے متعلق تھی:

اقرأ باسم ربك الذي خلق۔ خلق الانسان من علق۔ اقرأ وربك الاكرم الذي علم بالقلم علم الانسان ما لم يعلم (علق ۱ تا ۵)

پڑھو اس رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ خون کے جمے ہوئے لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھو اور تمہارا رب بڑا بزرگ ہے جس نے قلم کے ذریعہ تعلیم دی۔ انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت میں سب سے اہم فرائض تلاوت آیات، تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیہ نفوس قرار دیے گئے۔ قرآن کہتا ہے

هو الذي بعث في الاميين رسولا منهم يتلوا عليهم آياته ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة وان كانوا من قبل لفي ضلال مبين۔

وہی ہے جس نے امیوں کے اندر انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو انہیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے، ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے گرچہ وہ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔

سورہ آل عمران میں فرمایا:-

لقد من الله على المؤمنين اذ بعث فيهم رسولا من انفسهم يتلوا عليهم آياته ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة

یقیناً اللہ نے مومنوں پر بڑا احسان فرمایا جب کہ اس نے ان کے درمیان انہی میں سے ایک ایسا رسول برپا کیا جو ان کو اس کی آیات سناتا ہے ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

دمشق یونیورسٹی کے ڈاکٹر محمد المجذوب کا خیال ہے کہ اس سے زیادہ کسی ثبوت کی ضرورت ہے کہ قرآن پاک کے تقریباً ۷۵۰ حصوں میں ایمان لانے والوں سے خطاب کیا گیا ہے کہ وہ غور کریں اور اپنی عقل کا بہترین استعمال کریں۔ علم کے حصول کو ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض قرار دیا اور ایک باعمل عالم کو جاہل عابد سے بہتر بتایا اور اس بات کا فخر کا اظہار کیا کہ مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے۔

قرآن پاک میں جہاں تشکیل کائنات اور مظاہر کائنات کا ذکر آیا ہے خواہ وہ ارض و سما کی آفرینش سے متعلق ہو یا اُن کی مختلف انواع و اقسام اور ان کی تسخیر و تصرف کے بارے میں وہاں پہ یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ ان میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو آثار کائنات کی ماہیت، ساخت و تشکیل اور افادیت و مقصدیت پر غور کرتے ہیں۔

ان في ذلك لآيات لقوم يتفكرون

اس میں نشانیاں ہے ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر سے کام لیں

اخرجنا به ازواجا من نبات شتى كلوا وارعوا انعامكم ان في ذلك لآيات لاولي النهى (طہ)

پھر اس پانی سے ہم نے مختلف قسم کے نباتات کو اگایا اور تم سے کہا کہ خود کھاؤ اور اپنے مویشیوں کو بھی چراؤ بلاشبہ اس کے اندر عقل والوں کے لئے کھلی دلیلیں ہیں۔

قرآن پاک سے وہی لوگ صحیح طور سے استفادہ کر سکتے ہیں جو عقل و دانش کا صحیح استعمال کریں فرمایا گیا

انما يتذكر اولوا الالباب

"قرآن سے نصیحت صرف اہل خرد حاصل کرتے ہیں"

خدا سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔

انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء

ایک دوسرے مقام پر فرمایا کہ جس کو حکمت و دانائی عطا کی گئی اسے نعمت عظمیٰ مل گئی۔ ومن یوت الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا

اسلام کی اسی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ انسانی ذہن جس کو قدیم زمانے میں کاہنوں اور پیشواؤں نے علم کی نعمت سے محروم کر رکھا تھا، ہر قسم کے قید و بند سے آزاد ہوا چنانچہ آپ کے بعد سو سال بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک نئی تہذیب اور ایک نئے تمدن کے چراغ روشن ہو گئے اسلام کی اسی تعلیم و تلقین کی بدولت فرزندان توحید نے علوم و سائنس کے میدانوں میں نہ صرف سابقہ علوم و فنون سے استفادہ کیا بلکہ گراں قدر کارنامے بھی انجام دیئے چنانچہ یہ امر واقعہ ہے کہ مسلمانوں نے کیمیا، ریاضی، طبیعیات، جغرافیہ، نباتات، حیوانات ہر علم میں کوہ کنی کی اور دنیا کو فیض پہنچایا، جارج سارٹن نے ۷۵۰ء سے ۱۱۰۰ء تک کا مسلسل زمانہ عرب ترک افغان اور ایران کا زمانہ بتایا ہے اور ان سب کا تعلق عالم اسلام سے تھا۔ ۱۱۰۰ء کے بعد پہلی بار یورپی علماء جیسے راجر بیکن وغیرہ کا نام آتا ہے اور اس اعزاز میں ابن رشد، نصیر الدین طوسی اور ابن النفیس برابر کے شریک ہیں۔ یہ ابن نفیس وہی ہیں جنہوں نے [illegible] دوران خون کا نظریہ دریافت کیا۔ یورپ میں آج جو میڈیکل سسٹم رائج ہے اس کی داغ بیل مسلمانوں ہی نے ڈالی ہے بلکہ پلستر مسلمانوں ہی نے دریافت کیا تھا سرجری میں مسلمانوں نے کافی ترقی کی تھی۔

۱۴۳۶ء میں تیمور کا پوتا الغ بیگ مسلم علماء کے ساتھ علم الہیئت پر سرگرم مناظرہ اور تحقیق میں ڈوبا دکھائی دیتا ہے ۱۴۳۷ء میں بالمقابل یورپ کے مستند جدولوں کی چھ ڈگری زاویہ کی حد تک تصحیح کی گئی۔ ابوبکر رازی تھا۔ علم طب کا خصوصی ماہر اور دواؤں کے تیار کرنے میں کیمسٹری کا موجد تھا۔ ابن الہیثم علم طبیعیات کا سب سے زیادہ قابل اور ہونہار عالم تھا، ابو موسیٰ جابر بن حیان نے اپنی لیبارٹری میں لیڈ کاربونیٹ، آرسینک اور انٹیمنی سلفائڈ سے انٹیمنی اور آرسینک دھاتیں تیار کیں، دھاتوں کے صاف کرنے کے کیمیاوی طریقے ایجاد کئے، تقطیر کا طریقہ معلوم کیا۔ سائنس کی دنیا جابر کو کیمسٹری کا استاد مانتی ہے۔ البیرونی علم ہیئت کا ماہر، بہت بڑا فلسفی تھا۔ کرۂ ارض پر طول البلد اور عرض البلد سب سے پہلے اسی نے متعین کئے۔

غرض یہ کہ مسلم سائنس دانوں نے اسلامی تعلیمات کے نتیجہ میں علم و سائنس کے میدان میں کافی ترقیاں کیں اور دنیا کو اپنے کمالات سے فیض پہنچایا۔

لیکن پھر رفتہ رفتہ تحقیق و تجسس کی روح مسلمانوں میں مفقود ہو گئی اور اس بیداری سے یورپ نے فائدہ اٹھایا اور انہیں بنیادوں پر علوم و فنون کی عمارت اٹھانی شروع کی نتیجہ یہ ہوا کہ اقوام مغرب اس میدان میں ہم سے بہت آگے نکل گئے اور اس کی بدولت عرصہ دراز تک ہم پر اپنا تسلط بھی قائم رکھا اور آج بھی وہ ہر میدان میں ہم سے کہیں آگے ہیں غالباً اسی صورت حال کا رونا اقبال نے رویا ہے ؎

مگر وہ علم و حکمت کے کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو مغرب میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ
غرض میں کیا کہوں تم کو کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے
جہاں گیر و جہاں بانی و جہاں دار و جہاں آرا

مغربی تعلیم اور اس کے نقصانات

سیاسی میدان میں مغربی حملے ناکام بنا دیئے گئے۔ عالم اسلام ان کے تسلط سے رفتہ رفتہ آزاد ہو گیا۔ ہندوستان بھی طویل جدوجہد کے بعد ان کے سیاسی شکنجے سے رہائی پا گیا لیکن اس بار مغرب نے جو دام پھیلایا وہ بڑا خوشنما اور مہلک تھا اور اس میں سارے مسلمان گرفتار ہو گئے۔ یہ تھا تعلیم کا دائرہ جہاں مغربی تہذیب نے پوری مسلم سوسائٹی پر ضرب لگائی اور تعلیم کے ذریعہ مسلم نوجوانوں

کی غیرت و حمیت اور آزادی و خودداری اور خدا و رسول سے محبت کو کھرچ کر پھینک دیا۔ اس پوری صورت حال پر اکبر الٰہ آبادی کا تبصرہ سن لیجئے ؎

توپ کھسکی، پروفیسر پہونچے ؛ جب بسولہ ہٹا تو رندہ ہے

ایک انگریز نے اپنے بیٹے کو پسماندہ اقوام کو غلام بنانے کی کی ترکیب جو سمجھائی تو اقبال نے اسے یوں نظم کیا ؎

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے ادھر پھیر

پہلے تو اس بات کی کوشش کی گئی کہ مسلمانوں کو کم سے کم تعلیم دی جائے اور جب دینا ہی پڑے تو غلط قسم کی تعلیم دی جائے ایسی تعلیم جو مسلم ملت کو منتشر اور متفرق کر دے اسے اس کی اقدار و روایات سے دور کر دے اور اسے دین و دنیا کی کشمکش میں مبتلا کر دے بالآخر تعلیم کے اس جال میں مسلم روح پھڑپھڑا کر رہ گئی اور وہ بتدریج غلام بنتا چلا گیا

اس مغربی حملے کے اثرات اتنے دور رس ثابت ہوئے کہ :

۱۔ سیاسی و فوجی شکست کے باوجود سامراج مسلم نوجوانوں کے ذہن و دماغ پر مسلط ہو گیا اور جاتے جاتے اپنے ایجنٹ پیچھے چھوڑ گیا۔ اس تعلیم کی وجہ سے مسلمانوں کی تہذیب، ثقافت، عقائد و تصورات کا پورا نظام درہم برہم ہو گیا۔ دین و مذہب کی جڑیں کھوکھلی ہو گئیں۔ قوم پرستی کی طرف وہ لپکے۔ لادینیت کو انھوں نے حرز جاں بنایا۔ اشتراکیت میں انھیں اپنے دکھوں کا درماں نظر آیا۔ سیکولر ڈیموکریسی کی عیارانہ سازشوں کا شکار رہے۔ معاشی خوشحالی اور سائنسی ترقی کو معبود و مسجود قرار دیا اور جو قوم عالم کائنات کی رہبری و رہنمائی کے لئے پیدا کی گئی، وہ دوسروں کی غلامی کا شکار ہو گئی۔

۲۔ اس تعلیم نے اس کی روح و قالب کی دنیا برباد کر دی۔ ایک طرف اس کا شاندار ماضی تھا، اس کے عقائد و تصورات تھے، اس کی اپنی تہذیب اور ثقافت تھی، اس کی اپنی کتاب اور شریعت تھی اور دوسری طرف مغربی تہذیب کی خیرہ کن چمک تھی جس کے بارے میں اقبال نے صاف صاف کہا

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان حیران و ششدر رہ گیا کہ کس کو چھوڑے اور کس کو اختیار کرے

۳۔ اس نظام تعلیم نے ہمارے سابقہ وسیع تر نظام تعلیم کو غیر موثر اور کمزور بنا دیا۔ اب ہر مسلمان کا ذہن یا بستی میں پھیلے ہوئے مکتب اور مدرسے کی کوئی اہمیت نہ تھی بلکہ جو پہلے عالم اور تعلیم یافتہ شمار ہوتے تھے وہ اب جاہل، ملا اور وحشی اور غیر مہذب قرار پائے۔ دوسری طرف اس کا کوئی بہتر متبادل بھی نہیں دیا گیا۔ اور اس بات کی منظم کوشش کی گئی کہ کہیں واقعی مغرب کے معیار کے مطابق تعلیم یافتہ لوگ نہ پیدا ہو جائیں اگر ہو جائیں مسلمان نہ رہتا اور کافر بن جاتا اور مغرب کے معیار تک پہونچ جاتا تو بھی شاید کچھ مفید ہوتا لیکن مغرب یہ خطرہ مول لینے کے لئے تیار نہ تھا کیونکہ خود اسی مغرب کے ایک مصنف کے الفاظ میں :

ISV That "would have been dangerous

۴۔ سب سے خراب صورتحال یہ ہوئی کہ دین و ایمان کو بھینٹ چڑھانے کے بعد روٹی بھی میسر نہ آئی۔ اقبال کے الفاظ میں :

بایں مکتب بایں دانش چہ نازی
کہ ناں در کف نہ داد و جاں ز تن برد

معاش کے بہانے مغربی تعلیم کی طرف دوڑے لیکن نہ سائنسی ترقی ہاتھ لگی نہ روٹی میسر آئی اور دوسری طرف وہ روح جو ملت اسلامیہ کی زندگانی کی ضامن تھی وہ بھی تن سے رخصت ہو گئی بلکہ معاش تو کیا ہاتھ آتی فکر معاش مقدر بن کر رہ گئی۔

عصر حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے
قبض کی روح تری دے کے تجھے فکر معاش

بابوگیری اور منشی گیری کے چکر میں مسلمان نوجوان جو ثریا کے تاج نوچنے کے لئے پیدا کئے گئے تھے جنھیں دنیا کی امامت و پیشوائی کے منصب پر مامور کیا گیا تھا جو دنیا کو ایک نئے انقلاب کا راستہ دکھا

سکتے تھے، ایسے الجھے کہ ڈگری کا کاغذ ہاتھ میں لئے سڑکیں اور دفتر ناپتے رہے۔

عصرِ جدید کا چیلنج

یہ ہے وہ چیلنج جس کا ہمیں مقابلہ کرنا ہے یہاں معاشرہ جنہ وارث قائم کرنے، دینیات اور اسلامیات کے مضامین پڑھا دینے تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ ایک چہار طرفہ حملہ ہے جس کا ہم سب کو مقابلہ کرنا ہے اس ماحول میں جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں جو نظریات غالب ہیں وہ اسلام کے مخالف ہیں جو ادارے چل رہے ہیں ان کی بنیاد قومیت، لادینیت اور سیکولرزم پر ہے جو تہذیب و تمدن رواج پا رہا ہے سراسر غیر اسلامی تہذیب و تمدن ہے تو ہمیں سوچنا پڑتا ہے کہ

پھونک ڈالو یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

آج جب ہم اسلامی نظامِ تعلیم کی بات کرتے ہیں تو ہر ملا ہمیں ملا رجعت پسند اور بنیاد پرست کہا جاتا ہے اور للکارا جاتا ہے کہ

ملا کو اس کے کوہ و دمن سے نکال دو

لیکن جوانو اور بزرگو! اگر اس ملک میں اسلامی انقلاب لانا ہے اگر تعلیمی اداروں کو احیائے اسلام کی اس تحریک میں حصہ لینا ہے اور اساتذہ و طلبہ کو اسلام کے جذبے سے محبت ہے تو عزمِ محکم، عملِ پیہم اور محبتِ فاتحِ عالم کے ہتھیاروں کو مضبوط کر کے ہمیں اپنی منزل خود مقرر کرنی ہے

"معروف و منکر کا بقیہ"

"یا رسول اللہ ما حق المرأة علی احدنا علیہ؟ قال ان تطعمها اذا طعمت و تکسوها اذا اکتسیت ولا تضرب الوجہ ولا تقبح"

اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہم لوگوں میں سے کسی کی عورت کا حق اس پر کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر وہ کھانا چاہے تو کھلاؤ، پہننا چاہے تو پہناؤ، منہ پر مارو مت اور نہ اسے بدصورت قرار دو!

"عہدِ حاضر میں ہماری ذمہ داری کا بقیہ"

ہوتا ہے وہ ہر میں منظور ہے۔ اگر اس وقت ہم نے خوابِ غفلت سے آنکھیں نہ کھولیں تو اس بات کا پورا خطرہ ہے کہ مبادا کہیں اسپین کی تاریخ نہ دہرا دی جائے۔

میں آنے والے طوفان سے مسلمانوں کو باخبر کرتے ہوئے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اپنے اندر تبدیلی پیدا کریں۔ اخلاق و کردار جن کا دامن چھوڑ چکے ہیں اسے ایک بار پھر مضبوطی سے تھام کر اپنی عظمتِ رفتہ کو واپس لانے کی کوشش کریں۔ غیروں کی تقلید سے یکسر اجتناب کریں۔ اسلاف کے نقوشِ قدم کو ہر گام پہ اپنا رہنما بنائیں کہ اسی میں ہماری کامیابی کا راز مضمر ہے۔ اس کے بغیر فلاح و نجات کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکتی ہے

چمن کے مالی اگر بنا لیں موافق اپنا شعار اب بھی
چمن میں آ سکتی ہے پلٹ کر چمن کی روٹھی بہار اب بھی

اقبال پر ایک ترچھی نظر

فروغ احمد

موجودہ دور میں فلسفۂ اقبال پر بڑی گرماگرم بحثیں چل رہی ہیں۔ عالمی ادب میں اقبال کا مقام متعین کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں بعض نقادانِ شعر و ادب اس کا سرے سے انکار کرتے ہیں کہ عالمی ادب میں اقبال کا کوئی مقام نہیں گرچہ یہ مضمون کافی پرانا ہے اور ن، الف تبسم صاحب کے تنقیدی مقالہ کا جواب ہے جس سے اقبال کے فلسفۂ حیات اور فنِ شعر و ادب کے بعض گوشے ابھر کر سامنے آتے ہیں اس لحاظ سے یہ مقالہ آج بھی تازہ ہے

(ادارہ)

تنقید کے لیے خلوص شرط ہے۔ مکمل تنقید یا کامیاب تنقید کے لئے دو باتیں ضروری ہیں —— لیاقت اور دیانت۔ اقبال کے نوّے فیصد ناقدین نے اقبال کو معصوم عن الخطا اور فوق البشر قرار دیا، اور دس فیصد ایسے ہوئے جنھوں نے اسے معتوب بنا دیا۔ اشتراکی ادیبوں کی نظروں میں اقبال "ترقی پسند" تھے پھر معلوم نہیں کیا ہوا کہ ان میں "کثرتِ تعبیر" شروع ہو گئی اور ہوتے ہوتے یہ "خواب" ہی پریشان ہو کر رہ گیا۔ تقسیم کے بعد اب بیشتر اشتراکی ادیب اقبال کو رجعت پسند کہنے لگے ہیں۔ سبب اس کا یہ ہے کہ پاکستان میں قیامِ نظامِ اسلامی کی تحریک کو اقبال کی تصنیفات سے پوری پوری تقویت پہنچ رہی ہے۔ دین و سیاست، حکومتِ الٰہیہ اور ملتِ اجتماعیہ اسلامیہ وغیرہ موضوعات کے متعلق ان کے ہاں اس قدر واضح تصریحات موجود ہیں کہ ان کی تاویل نہیں کی جا سکتی۔ اب ایسے "ترقی

رنگ رہ گئے ہیں جو حقیقت الامر کے علی الرغم کلامِ اقبال کی من مانی تعبیر کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ مثلاً بمبئی کے مسٹر عزیز احمد صاحب نے اپنی ایک تازہ تصنیف "اقبال —— ایک نئی تشکیل" میں اقبال کی اسلامی شاعری کی تاویل مارکسی نقطۂ نظر سے فرمائی ہے۔ کتاب مذکورہ کا انتساب "ممتاز دولتانہ" کے نام ہے۔ البتہ بعض "ترقی پسند" نقاد ہیں، جنھوں نے جھلا کر اب یہ اعلان کر دیا ہے کہ اقبال ایک "طبقاتی" شاعر ہیں اور اس طرح اقبال کے تمام محاسن معائب بن چکے ہیں۔

"ن۔ ا۔ تبسم" کو میں نہیں جانتا، انھوں نے جا بجا نفسیات کا حوالہ دیا ہے اور اس کا سہارا بھی لیا ہے لیکن وہ خود عالمِ نفسیات ہیں بھی کہ نہیں اس کا اندازہ نہ ہو سکا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اقبال کو براہِ راست نہیں پڑھا ہے اور ادھر ادھر جہاں کہیں انھیں کسی کی کوئی تحریر ملی، اس سے مواد فراہم کر کے "اقبال پر ایک

نظر" نالی ہے۔ تنقید بہت مشکل فن ہے۔ اس میں اصول اور تکنیک کو زیادہ دخل ہے اور انشاء کو بہت کم۔ اردو میں اسلامی ادب کی تحریک جوں جوں آگے بڑھ رہی ہے ہم سلجھے ہوئے صالح تنقید نگاروں کا فقدان شدت سے محسوس کر رہے ہیں۔ لیکن ہمارا ادب کی دنیا میں بھی کوئی سلجھا ہوا تنقید نگار دکھائی نہیں دیتا۔ پروفیسر احتشام اور ممتاز حسین کی تنقیدوں میں جذبات اور انشاء دونوں غالب ہیں۔ بے مسلک ناقدین میں پروفیسر آل احمد سرور کے یہاں تنقید کم ملے گی اور "تنقیدی اشارے" زیادہ ملیں گے۔ وہ اشارے اور کنایوں سے اس قدر کام لیتے ہیں کہ ان کی تنقیدی تحریریں انشائے لطیف کے نمونے بن جاتی ہیں۔ رشید احمد صدیقی فکر کی پختگی اور نظر کی وسعت کے ساتھ ساتھ اچھے طنز نگار سے اچھے تنقید نگار بنتے چلے جا رہے ہیں لیکن حقیقی معنوں میں صحت مند تنقید کے لیے ضروری ہے کہ پر خلوص تحقیق، سلجھا ہوا اسلوب اور دور رس تجزیہ ان تینوں عناصر یکجا ہوں، ان تینوں عناصر ترکیبی کے امتزاج سے ہی مدلل، واضح اور صحت مند تنقید اسلامی ادب میں جنم لے سکتی ہے۔ ابن ا۔ تبسم کو چاہیے کہ انشاء پرداز تنقید نگاروں کے چکر سے نکل کر اپنی دنیا آپ بنائیں .... اپنی نظر آزادانہ: تحقیق اور بے لاگ تنقید ... یہ ہے ہمارا لائحہ عمل۔ ان کا تو ہمارے سامنے ان کا جو نمونہ ہے وہ کسی اچھی رائے قائم کرنے میں کوئی مدد نہیں دیتا تاہم دیکھا جائے اگر دیکھیں کہ ان کے مقالے کی ہیئت ترکیبی کیا حیثیت رکھتی ہے۔

(۱) تبسم صاحب لکھتے ہیں کہ "اقبال نے شاعری جیسی خوبرو حسینہ کو عروض کی غلطیوں سے ...... بری طرح زخمی کیا ہے" اقبال کے متعلق یہ بات تو بہت پرانی ہو چکی ہے تاہم اگر آپ اقبال کی عروضی خامیوں کی چند مثالیں دے دیتے تو اچھا ہوتا۔ یہاں ہمارا ذہن نیاز فتح پوری اور مہتاب اسکول کے تنقید نگاروں کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ بے شک اس کی ضرورت ہے کہ اقبال کے غلط اشعار متعین ہو جائیں۔ ہم تو بہرحال اسے شاعر نہیں مانتے رہی "اقبال امت" تو آپ صرف یہ کہہ کر تو اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے کہ اقبال

کا سارا کلام مہمل اور لایعنی ہے۔

(۲) تبسم صاحب نے کلام اقبال کا موازنہ مومن، غالب اور میر کے اشعار سے کیا ہے۔ لیکن افسوس کہ اقبال کے کم و بیش ایک ہزار اشعار میں سے آپ کو صرف دو اشعار اس قابل ملے ہیں

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

اور یہ —
نظر میری نہیں ممنون سیر عرصۂ ہستی
میں وہ چھوٹی سی دنیا ہوں کہ آپ اپنی ولایت ہوں

اس قسم کے اور بہت سے اشعار پیش کر سکتے تھے مثلاً ایک شعر ملاحظہ ہو

بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا
تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی

سچ تو یہ ہے کہ اب اس طرح کے موازنوں کا وقت نہیں رہا۔ میر، غالب اور مومن تو بہت اونچی چیزیں ہیں۔ زبان و فن کے اعتبار سے اقبال کے بہت سے اشعار بعض غیر معروف "اساتذہ" کے کلام سے بھی فروتر ہیں، اپنے فنی استقام کا اعتراف تو خود اقبال کو تھا لیکن پھر بھی آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ جہاں اس نے اسلام کی تعمیری قدروں کو اجاگر کیا ہے وہیں ادب اور فن میں بھی نئی راہیں سجھائی ہیں اور اس اعتبار سے باوجود چند در چند خامیوں کے وہ بہرحال ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔

(۳) تنقید نگار نے اقبال کی غلطی ثابت کرتے ہوئے جو قطعہ پیش کیا ہے وہ ایک مسلسل غزل کے آخری دو اشعار ہیں۔ اپنے سیاق و سباق کے ساتھ ان اشعار کا مفہوم اس سے مختلف ہے جو انھوں نے متعین کیا ہے۔ دیانت دار ناقدین کا فرض ہے کہ اقتباسات اور حوالہ جات کے ضمن میں سیاق و سباق پر ہرگز پردہ نہ ڈالیں۔ زیر بحث غزل مسلسل جاوید نامہ میں "نغمۂ ملائک" کے عنوان سے موجود ہے۔ اس سے حضرت آدم کا مفہوم واضح ہے۔ اقبال کی غلطی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مرتب چراغ راہ نے اپنے حاشیہ میں اس امر کی طرف اشارہ کیا تھا۔

نمونہ ملاحظہ ہو۔ ؎

زروئے مشت خاک از نوریاں افزوں شود روزے

زمین از کوکب تقدیر او گردوں شود روزے

خیالِ او کہ از سیلِ حوادث پرورش گیرد

ز گردابِ سپہرِ نیلگوں بیروں شود روزے

یکے در معنیِ آدم نگر۔ از ما چہ می پرسی

ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے

چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے

کہ یزداں را دل از تاثیرِ او پرخوں شود روزے

۳۔ تبسم صاحب بڑے شد و مد کے ساتھ ایک جگہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ "اقبالیات نطشے کے مقولوں اور فلسفہ کا ترجمہ ہے" انھوں نے نطشے کے جو مقولے نقل کئے ہیں ان کے بالمقابل اقبال کے اشعار بھی دے دیتے تو مناسب ہوتا۔ حالانکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان کی یہ کوشش ہرگز کامیاب نہ ہوتی اور شاید انھیں بھی اس کا احساس ہے۔ ملاحظہ ہو۔

نطشے کہتا ہے:۔ "نیکی کیا ہے؟ وہ سب کچھ جو احساسِ قوت میں اضافہ کرے وغیرہ وغیرہ ۔۔۔"

اقبال کہتا ہے:۔ غیرِ حق چوں ناہی و آمر شود

زور ور بر ناتواں قاہر شود

نطشے کہتا ہے:۔ "جسے خیر و شر کے میدان تخلیق کا کام کرنا ہو اسے سب سے پہلے تباہ کار ہونا چاہیئے تاکہ وہ قدروں کو چور چور کر دے۔" اس میں کیا قباحت ہے؟ رومی " نطشے سے پہلے کہہ گئے ہیں۔ ؎

ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند

اول آں بنیاد را ویراں کنند

اور اقبال نے اسی پر تضمین لگائی ہے۔

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند

(می دانی) اول آں بنیاد را ویراں کنند

نطشے کہتا ہے:۔ "جمہوریت مرشہ زوری کے ابلیسیا کا نام ہے"

اقبال اپنی اسلامی بصیرت کے ماتحت کہتا ہے:۔ ؎

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

(نطشے نے "جلالِ پادشاہی" کی کبھی برائی نہیں کی)

نطشے کہتا ہے:۔ "عورت بنیادی طور بچوں کی دیکھ بھال کرنے کیلئے ہے۔"

اقبال اہلبیت کی زندگی کو سامنے رکھ کر کہتا ہے:۔ ؎

مزرعِ تسلیم را حاصل بتولؑ

مادراں را اسوۂ کامل بتولؑ

تبسم صاحب کے پیش کردہ نطشے کے اقوال سے موازنہ کرنے کے لئے میں نے اقبال کے جو اشعار بالمقابل دیئے ہیں وہ تو مشتے نمونہ از خروارے ہیں ورنہ اقبال کا سارا ذخیرہ ہی اس طرح کے اشعار سے بھرا پڑا ہے۔ آپ تحقیق کر کے دیکھ لیں۔ کہیں آپ کو خدا، قوت، خیر و شر، سیاست، اخلاقیات اور عورت وغیرہ کے متعلق نطشے کے اقوال اور اقبال کے افکار متوازی دکھائی نہ دیں گے۔ مسلمانوں میں اقبال کے پیام کی مقبولیت کے پیش نظر بعض بدخواہوں نے یہ پروپیگنڈا شروع کیا تھا کہ اقبال کا فلسفہ نطشے وغیرہ سے ماخوذ ہے۔ خود اقبال نے اس قسم کے اعتراضات کی دھجیاں اڑا دی ہیں۔ ملاحظہ ہو اقبال کا معرکہ آرا خط فلسفہ عجم کے مترجم ڈاکٹر نکلسن کے نام۔ تبسم صاحب کا یہ ارشاد کہ "ہماری اقبالیات کی بنیادیں نطشے کے فلسفہ اور مواد پر قائم ہیں گی" اس قدر غیر سنجیدہ اور وزن ہے کہ اس کے متعلق کچھ کہنا بھی فضول ہے۔ اقبال کے کثیر بلکہ خالص نے اس قسم کی بات کبھی نہیں کی ہے۔ لوگوں نے زیادہ سے زیادہ "قوت" اور "فوق البشر" کے باب میں اقبال کے متعلق اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ لیکن جہاں کا انداز بیان اتنا غیر محتاط نہیں ہونے پایا ہے۔ یوں لکھنے کو تو جی میں آئے لکھا جا سکتا ہے لیکن تحقیق اور اپج میں ایک تین فرق ہے جسے ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ تنقید نگار کو شاعری سے زیادہ کر ایک ایک جملہ ذمہ داری کے احساس کے ماتحت لکھنا

چاہیئے۔ اس موقع پر مجھے ممتاز حسین کا ایک جملہ یاد آرہا ہے۔ اپنی کتاب "نقدِ حیات" میں اقبال کے تصورات پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں "کاش اقبال اپنے مردِ مومن کو کم از کم ایک بار مذہب سے الگ کرکے دیکھ سکتے"۔ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر عزیز احمد اپنی کتاب "اقبال — ایک نئی تشکیل" میں رقم طراز ہیں کہ "اقبال کے مردِ مومن کو بالکل مسلمان سمجھنا غلط ہے"۔ غرض یہ کہ انشاء پرداز تنقید نگاروں کے چکر میں پھنس کر تنقید نگاری کے لئے مواد فراہم کرنا چاہیں تو اس طرح کے بے شمار شہ پارے ہاتھ لگ سکتے ہیں۔

تبسم صاحب "اسرار و رموز" کے "الماس و زغال" کا حوالہ دیتے لکھا۔ بیشک یہ نطشے کے "پتھر اور کوئلہ" سے ماخوذ ہے۔ جرمنی کے ایک پی۔ ایچ۔ ڈی ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری مرحوم "اسرار و رموز" پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں "کیا اقبال نطشے کے زیرِ اثر ہے؟ میرا جواب مثبت ملتا ہے۔ وہ ہمیشہ مستعار چیز کو جلا بخش کر ایک نئی اور انوکھی چیز بنا لیتا ہے مثال کے طور پر "اسرارِ خودی" کی حکایت "الماس و زغال" کو لیجئے۔ جو نطشے کی تصنیف ارشاداتِ زرتشت کی حکایت "پتھر اور کوئلہ" سے ماخوذ ہے۔ مگر چونکہ اقبال نطشے سے بزرگ تر شاعر ہے، اس نے پتھر کو اس طرح کاٹا اور صیقل کیا کہ الماس اس کا اپنا بن گیا"۔ اقبال کہیں سے کچھ لفظاً بہ لفظ ترجمہ یا نقل نہیں کرتا ہے بلکہ محض اخذ کرتا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ اس کی اپنی انفرادیت ختم نہیں ہوتی۔ اس کے یہاں آپ کو سنسکرت، انگریزی اور جرمن شاعروں کے متعدد تراجم ملیں گے کیا وہ سب محض تراجم ہیں؟ وہ کہیں سے کچھ لیتا ہے تو وہی کچھ لیتا ہے جو اس کے اپنے مزاج کے موافق ہوتا ہے، وہ خود بہتر سے بہتر تخلیق کر سکتا ہے اور کرتا بھی ہے لیکن وہ دوسروں کی قدر و منزلت پر پردہ نہیں ڈالتا کیونکہ وہ عظیم ہے، متکبر نہیں ہے۔ اس نے راجہ بھرتری ہری کے شعر کو سرِ دیوان بنانے میں عار محسوس نہیں کی۔ اقبال کے مزاج اور نفسیات کا مطالعہ ہم لوگوں کو بہت احتیاط سے کرنا چاہیئے اور اسی سے سبق لینا چاہیئے۔

تبسم صاحب کا یہ استنتاج کہ ... "علامہ نطشے کے مثبت فلسفہ

پھر اپنے خودی کے فلسفے کی داغ بیل ڈالتے ہیں محض اس لئے کہ اس میں اسلام کا کچھ جواز ملتا ہے جو کہ عین فطرت کے مطابق تھا ......" بالکل درست ہے البتہ انداز بیان ذرا اور پروقار ہو سکتا تھا۔ عیسوی صدی میں اقبال جیسے فرنگی بت کدے میں کھوئے ہوئے مسلمان کو اسلام کا نام لیتے ہوئے جھجک محسوس نہیں ہوئی۔ چارلس وکنسن نے ایک بار اسی قسم کا اعتراض کیا تھا جیسا کہ عام طور پر ہم آپ سب کچھ سوچا کرتے رہتے تھے۔ اس جواب میں اقبال نے ڈاکٹر نکلسن کو ایک طویل خط لکھا تھا۔ اس میں بقائے شخصی، تصادم، مسئلہ زمان، جنت کوشی وغیرہ کے بارے میں انھوں نے اپنے اور نطشے کے خیالات کا موازنہ کر کے حقیقت الامر کو واضح کیا ہے اور بتایا ہے کہ ہر دو میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ آخر میں انھوں نے ایک ایسی بات کہی ہے جسے اقبال کے ہر ناقد کو ازبر کر لینا چاہیئے۔ "میں یہ کہ ایک مسلمان اہلِ علم جب ان مسائل کو نئے تجربات اور افکار کی روشنی میں بیان کرتا ہے جن کا مبداء اور سرچشمہ قرآن مجید ہے تو اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ جدید افکار کو قدیم لباس میں پیش کیا جا رہا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ پرانے حقائق کو جدید حقائق کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔ بدقسمتی سے اہلِ مغرب اسلامی فلسفے کی تعلیم سے ناآشنا ہیں"۔ اقبال کا یہ خیال "اہلِ مغرب" کے بارے میں ہے لیکن ہم اہلِ مشرق کیا کم ہیں۔ سچ ہے —

نہ مغرب اس سے بری ہے نہ مشرق اس سے بری
جہاں میں عام ہے قلب و نظر کی بیماری

تنقید نگار نے شاید بالکل غیر ارادی طور پر اقبال کو کارلائل، بشنکر، اسپنوزا، فشٹے، شوپنہار، نطشے اور برگساں کے ساتھ ایک صف میں کھڑا کر دیا ہے۔ ان کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کا "مردِ مومن" جو دراصل قرآن کا مردِ مومن ہے، ان مغربی مفکرین کے HERO GENIUS اور SUPER MAN وغیرہ کا چربہ ہے۔ حالانکہ اقبال کا مردِ مومن اقبال کی تخلیق نہیں، یہ قرآن کا آئیڈیل ہے —

یہ نکتہ کسی کو نہیں معلوم کہ مومن — قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

اقبال کے مرد مومن کو سمجھنے کے لئے "فرنگی ابجد کے دروس" میں گم ہونے کی ضرورت نہ تھی۔ قرآن میں ڈوبنے کی ضرورت ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں کی سیرتوں کے مطالعے کی ضرورت ہے اور پھر اپنے آپ پر ایک نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ خودی کو مستحکم کرنے کا یہی طریقہ ہے اور اسی طرح سے آدمی "مرد مومن" بنتا ہے۔ "قوت القہر" وغیرہ کا کوئی ذہن سے باہر نہیں ہوتا۔

علامہ تبسم صاحب فرماتے ہیں: "اقبال کی ضرب کلیمی کے لئے نظام فرعونی اور طلسم سامری بھونا شد ضرور کیا ہے۔" اقبال کے یہاں حضرت ضرب کلیمی ہی تو نہیں، اس کے پاس اور بہت کچھ ہے۔ پھر اس نے عہد حاضر کے فرعونوں کے خلاف اعلان جنگ کر کے کوئی گناہ تو نہیں کیا ہے۔ اگر محض اس بنا پر نفسیات داں کی ترنگ میں اقبال کو احساس کمتری کا مریض قرار دیا جا سکتا ہے تو نعوذ باللہ انبیاء علیہم السلام کے لئے بھی یہی تشخیص متعین ہوتی ہے اور اسلام کا رکن اعظم "الجہاد" بھی اسی تشخیص کی لپیٹ میں آ جاتا ہے کیونکہ جہاد کے لئے انتشار طاغوت اور دار الحرب شرط لازم ہیں۔ ع

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

کاش اقبال کے کسی نادان مبصر کو بھی یہ نکتہ سوجھا ہوتا۔

اصل میں یہ جسارت تنقید نگار نے انگلستان کے اسرائیلی مفکر C.E.M. JOAD کے ایک قول کے سہارے پر کی ہے۔ جوڈ کو انہوں نے "مشہور ماہر نفسیات" کہا ہے۔ میں نے اس کی تین چار کتابیں اور بیسیوں مقالوں کا مطالعہ کیا ہے۔ سچ پوچھئے تو وہ کہیں ماہر نفسیات نظر نہیں آیا۔ بلاشبہ جدید افکار کی تمام اصناف پر اس کی نظر ہے اور معقول نظر ہے، لیکن اس کا میلان زیادہ تر افلاطون — "OVED PLATONIC" مدرسہ فکر کی طرف ہے۔ اس کا اقتباس آپ نے اس اہتمام سے پیش کیا ہے، جیسے کوئی آیت قرآنی یا حدیث کی کوئی مستند عبارت ہو۔ اور پھر کس طرح سا گری یا اچھل کر فرماتے ہیں

"اب گویا وہ مہم فلسفہ خودی کا کو اقبال کے احساس کمتری کا رد عمل کہیں تو ــــــ تبسم صاحب کو میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ جوڈ کی (GUIDE TO MODERN WICKEDNESS) کا بغور مطالعہ فرمائیں۔ میرا تو یہ اندازہ ہے کہ انہوں نے اقبال کے انگریزی خطبات کا بھی بالاستیعاب مطالعہ نہیں فرمایا ہے۔ اس کا ایک اقتباس کہیں سے دستیاب ہو گیا ہے۔ یہاں بیگانی کی ایک معقول وجہ یہ ہے کہ منقولہ عبارت میں ایک جگہ فاش غلطی ہے۔ اصل نسخہ میں یہ غلطی نہیں ہے اور اسی غلطی کی بنا پر قدرتی طور پر ترجمہ بھی غلط ہو گیا ہے[۱]۔ ....

یہ محض فرو گزاشت نہیں ہے، اسا یہ دعویٰ کہ اقبال کا تصور خودی اقبال کے "احساس کمتری" کی پیداوار ہے، غالباً استدلال کا سارا دار اس فقرے پر مرکوز ہے "OUR ONLY FEAR IS THAT" "لیس ہمیں صرف یہ اندیشہ ہے کہ ..." چونکہ اقبال کا منشاء اس سے یہ ہے کہ "نشاۃ ثانیہ مغربی تہذیب کی ظاہری سطحیت سے گذر کر اس کی حقیقی داخلیت کا تجربہ حاصل کرے اگر اس عہد میں کتنے ہیں جو مغربی تہذیب کی ایک سطحی پی کر بھی ہوش میں رہیں، یہ اقبال کا ظرف ہے کہ وہ خم کے خم لنڈھا جاتا ہے لیکن کبھی بہکا نہیں۔ وہ تو شراب اور "مے" میں بھی ظرف پیدا کرنا چاہتا ہے اور اسے مخمور کرتا ہے کہ دیکھو! کہیں ایک گھونٹ میں ہی بہک نہ جانا۔ اور ہمارے تنقید نگار صاحب فرماتے ہیں کہ اقبال FEAR FLASHAU (آسیب خوف) میں مبتلا ہے۔

۱۱۔ ایک عجیب اعتراض یہ ہے کہ اقبال نے حیات کے صرف مثبت پہلو پر زور دیا ہے اور اس کے "منفی" پہلو کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اس طرح اس نے گویا زندگی کی کلیت پر ضرب لگائی ہے۔

اول تو پیام اقبال کی طرف اور تاریخی اضافیت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ دوسرے اگر زحمت تفکر گوارہ ہو تو اقبال کے یہاں "خودی" کے مقابلے میں "بے خودی" کے منفی تصور پر بھی لاتعداد اشعار کا ذخیرہ یہاں موجود ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اقبال کا تصور "بے خودی"

---

[۱] معزز خلیل بیگ صاحب نے بھی اس مقام پر گرفت کی ہے۔ ـــــــ [۲] معزز خلیل بیگ صاحب نے بھی اس کی نشاندہی کی ہے، اس لئے بجز ضروری تفکر ادے بچنے کے لئے چند سطور اس مقام سے حذف کر دی گئی ہیں۔ (ادارہ)

حاصل' اجتماعی خودی' کے مترادف ہے، لیکن اس میں فرد کی "جماعت" کے اندر "گم شدگی" کا مفہوم بھی پوشیدہ ہے۔ یقیناً اقبال کے "حقیقت خودی" میں شوپنہاور کی منفیت نہیں ملے گی لیکن "اسرار خودی" کے مقابلے میں بہرحال ایک منفی حیثیت حاصل ہے۔ البتہ مشینی عہد کے نوعمر نوجوانوں کے لیے یہاں وہ جاذبیت نہیں جس کے وہ طالب ہوتے ہیں۔

اقبال کے ناقدین کو چاہیے کہ اقبال کے "اسرار و رموز" کا مکمل طور پر مطالعہ فرمائیں، اور دیکھیں کہ جہاں انہوں نے انفرادی خودی کے اثبات پر زور دیا ہے وہاں انہوں نے اجتماعیت کی خاطر انفرادی بے خودی کی بھی تلقین کی ہے۔ اقبال کے یہاں یہ مثبت اور یہ منفی دونوں لہریں متوازی طور پر موجود ہیں۔ جدید مفکرین میں اور کس کے یہاں یہ بات ہو تو اس کی نشاندہی کیجئے۔

معلوم نہیں اس عبارت کا کیا مطلب ہے: "جہاں اقبال کے کلام کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے مذہب، فن اور سائنس تینوں کو ملا کر ایک نئے فلسفہ میں کمال حاصل کیا ہے، وہاں اس کے دوسرے رخ میں ان کے زوال کا ایک بھیانک عکس بھی نظر آتا ہے، کیونکہ مذہب فلسفہ اور سائنس ایک دوسرے کی نقیض اس قدر ہیں کہ جس دور میں زندگی کا تضاد اور تناقض اس کا آہنگ ہے" ــــ اس عبارت سے سوائے چند بھاری بھرکم الفاظ کے اور کچھ پلے نہیں پڑتا۔ کچھ الفاظ اور ہوتے تو شاید مطلب واضح ہو جاتا! مثلاً قدریں، تحت الشعور، ماورائیت وغیرہ۔

اسی قسم کی ایک عبارت یہ ہے: "افکار انسانی بہت حد تک جبلی سرچشموں سے متاثر ہوتے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت کے معروضی ہونے کی دلیل نہیں" ــــ دو جملے ہیں اور دونوں میں کوئی معنوی ربط نہیں۔ معلوم نہیں "معروضیت" اور "منفیت" سے کیا مراد ہے۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ نفسیات کی یہ دونوں اصطلاحات بالترتیب OBJECTIVITY اور SUBJECTIVITY کے مترادف ہیں۔ افکار انسانی پر جبلی سرچشموں کی اثر اندازی یقیناً حقیقت کے معروضی ہونے کے منافی ہے۔ یہاں لیکن کا کیا محل ہے

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے نقاد بعض قسم کے انشاء پردازانہ چٹکلوں کے سحر سے متاثر ہو چکے ہیں، انہیں کچھ الفاظ و اصطلاحات اور کچھ جملے کے اسلوب بڑا مرغوب ہو جاتے ہیں، وہی ان کی تحریروں میں بے ساختہ آ جاتے ہیں۔ یہ مرض عام ہوتا جا رہا ہے۔ اگر ہم نے ابھی سے اس کا تدارک نہ کیا تو اردو میں آرنلڈ اور محمد حسن عسکری تنقید طفولیت کی موت مر جائے گی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے اردو ادب پر "تنقید لطیف" کا ایک سمندر بن چھا جائے گا۔

تبسم صاحب اقبال کو طبقاتی شاعر کہتے ہیں، کہیں ان کی مراد "فرقہ پرست" تو نہیں، لیکن اگر طبقات کے خالص اشتراکی مفہوم کے مطابق انہوں نے یہ حرکت فرمائی ہے تو اس پر ہمارا کچھ کہنا بے کار ہے۔ البتہ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اگر انہیں پاکستان کی رائے عامہ کا خوف نہ تھا اور وہ FAIR FLASHING میں مبتلا نہیں تھے تو انہوں نے کھل کر اپنا مسلک کیوں نہ ظاہر کر دیا۔ یقیناً اس میں بھی کوئی نفسیاتی پیچ ہے!

(۹) اپنے آخری پیراگراف میں تبسم صاحب نے جس خیال کا اظہار فرمایا ہے اسے میں ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب کے ایک مقالہ مطبوعہ ماہ نو میں گزشتہ سال پڑھ چکا ہوں۔ اقبال نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا بلکہ محض خودی کی اساس پر ایک نظام حیات مرتب کیا جا سکتا ہے، وہ یہ ضرور کہتا ہے کہ حق "فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود"۔ لیکن حیثیت اجتماعیہ کے لیے وہ "بے خودی" کا تصور پیش کرتا ہے اور یہ صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ فرد "اپنے وجود" کو جماعت "میں گم" کر دے تو ایک حیثیت اجتماعیہ قائم ہو جائے گی بلکہ اس کی تفصیلات میں جانے کی بھی ضرورت ہے۔ آپ "اسرار خودی" کی سرسری تفصیلات کے ساتھ ساتھ "رموز بے خودی" کے تمام تر بنیادی مقامات پر بھی ایک نظر ڈال جائیں، اور پھر دیباچہ "رموز بے خودی" کی اس عبارت پر غور کریں۔

"....حیاتِ ملیہ کا انتہائی کمال یہ ہے کہ افرادِ قوم کسی آئینِ مسلم کی پابندی سے اپنے ذاتی جذبات کے حدود مقرر کریں تاکہ انفرادی اعمال کا تباین اور تناقض مٹ کر تمام قوم کے لئے ایک قلبِ مشترک پیدا ہو جائے" ___ اس اقتباس میں جس "آئینِ مسلم" کا حوالہ دیا گیا ہے، اس کے متعلق خود اقبال یوں فرماتے ہیں:

تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست
زیرِ گردوں سرِّ تمکینِ تو چیست
آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم
حکمتِ اُو لایزال است و قدیم
از یک آئینی مسلماں زندہ است
پیکرِ ملت ز قرآں زندہ است

لا! یہ بات کہ "آدمی سن رسیدہ ہو کر نکھر سکتا ہے ... بدل نہیں سکتا" ___ ہے تو بڑی لطیف اور یہ اندازِ بیان بلاشبہ پروفیسر احتشام حسین جیسا ہے لیکن وہ کھوکھلا اندازِ بیان ہی سے ہوتا ہے۔ بدلنے میں دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو ہم فوق البشر ہو جائیں یا تحت البشر بن جائیں۔ تیسری کوئی صورت نہیں۔ لیکن فوق البشر انسانوں میں آج تک پیدا نہیں ہوا۔ اس کا انسانوں میں کیا کام۔ البتہ کرۂ ارض آج تحت البشر مخلوق سے بھرا ہوا ہے۔ فرد فرد کو کھا رہا ہے، قوم قوم کو ہڑپ کرنے کے درپے ہے اور بلاک بلاک سے ٹکرا رہا ہے۔ یہ دنیا درندوں کی دنیا بن گئی ہے۔ اگر بدلنا یہی ہے تو ہم ایسے بدلنے سے عاجز آچکے ہیں اور فوق البشر بن نہیں سکتے لہٰذا اصل علاج یہ ہے کہ ہم انسان بنیں اور اپنی انسانیت کو نکھاردیں۔ آپ نکھرنے کو خاطر میں نہیں لاتے اور ہم آپ کی بات میں نہیں آتے کیونکہ ہم "بدلنے" کا حشر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ انسانیت کو بدلنے اور مسخ ہونے سے بچانا ہے اب اسے نکھارنے ہی کی ضرورت ہے۔

آج ہمیں اس دستورِ حیات کی ضرورت ہے جو انسانیت کو پروان چڑھا سکے۔ بیشک وہ دستور اقبال کا اسلام نہیں ہو سکتا، میں اسے عرض کر چکا ہوں کہ خود اقبال کے نزدیک وہ "آئینِ مسلم" وہ دستورِ حیات اسلام ہے۔ اقبال کا کارنامہ صرف یہ ہے کہ اس نے ہمیں اس قابل بنایا کہ ہم اپنے آپ کو پہچانیں اور یقین و عشق کی لذت کے ساتھ اسلام پر عمل کریں۔ بیشک اس کے فلسفہ میں حرکت کا عنصر موجود ہے لیکن یہ وہ "حرکت" نہیں جو ..... پروفیسر عزیز احمد کو مارکس اور اقبال کے یہاں یکساں دکھائی دیتی ہے۔ حرکت اور ارتقا کو صحیح مفہوم ذہن نشین کرنے کے لئے ہمارے "ناقدین" کو "عالمِ قرآن" کے متعلق ان اشعار پر غور کرنا چاہیئے جنہیں اقبال نے "جاوید نامہ" میں بزبانِ افغانی یوں ادا کیا ہے:

لایزال و ہر زماں نقشش نو بنو ۔۔۔ برگ و بارِ محکماتش نو بنو
باطنِ اُو از تغیر بے غمے ۔۔۔ ظاہرِ او انقلابِ ہر دمے

اقبال معصوم عن الخطا نہیں ہے۔ ضرورت ہے کہ خلوص اور دیانت کے ساتھ ہم اس کی غلطیوں کی نشاندہی کریں۔ اب اس بحث کو ختم ہونا چاہیئے کہ اقبال کے یہ اشعار حضرت غالب کے ان اشعار کے مقابلے میں ایسے ہیں اور ویسے ہیں، یا اقبال فلاں مغربی مفکر سے متاثر ہے اور اس کے فلاں فلاں تصورات نطشے، فطشے وغیرہ سے ماخوذ ہیں کیونکہ معاملہ اب اقبال کی حد تک ہی محدود نہیں ہے۔ اس کا پیام اور اس کے افکار ایک پوری ملت پر اثر انداز ہو چکے ہیں اس لئے اب سے ناقدین پر بالکل نئی ذمہ داریاں عائد ہو گئی ہیں اب وہ اقبال کی شخصیت یا اس کی ذاتی خصوصیات سے بحث کر کے لفظی حاشیوں میں مبتلا نہیں رہ سکتے اب تو انہیں اقبال کے پیام اور کلام کو انہی عمرانی قدروں کے معیار پر جانچنا اور پرکھنا ہے، جن کا وہ خود علمبردار تھا اور وہ قدریں اس کی ذاتی ملکیت نہیں بلکہ اپنا تاریخی اور عمرانی مقام رکھتی ہیں۔ انہی اقدار و تدوین کی بدولت اس کا پیام ایشیا کی ایک تہائی آبادی کے بختِ خفتہ کو بیدار کر رہا ہے۔ ہمیں اب ایک ایک مقام پر انگلی رکھ کر یہ بتلانا ہے کہ اسلامی معیارِ فکر کے اعتبار سے یہ نقص ہے اور یہاں یہ خامی ہے، یہاں اقبال کا تصور نہایت واضح اور روشن ہے اور یہاں اس کا فکر مبہم اور دھندلا

ہے۔ تضاد اور تناقض اس مقام پر ہے اور توافق اور سلامتی اس جگہ بے شعوری میں اقبالیات کے چند جراثیم یہاں گھس آئے ہیں اور یہاں اس کی اسلامی بصیرت کے سفید داغوں نے ان مہلک جراثیم کو ختم کیا ہے۔ اگر اقبال کا پیغام "تقدیر امم" سے وابستہ نہ ہوتا تو ہم ہرگز یہ جرأت سر مول نہ لیتے۔ لیکن صورت حال یہ مجبور کر رہی ہے کہ اقبال پر اب ہم ایک خاص زاویہ نگاہ سے تنقید کریں۔ پاکستان میں محبانہ اور عاشقانہ تحریک اقبالیات ہی کے بعض مبہم نقوش سے اپنے سانچے تیار کر رہی ہیں اور نظام اسلامی کی تحریک کو بھی اقبالیات ہی کے واضح افکار سے تقویت حاصل ہو رہی ہے۔ کیا یہ ضروری نہیں کہ اس کے مبہم نقوش اور واضح افکار کی انتشار پرور دو رنگی کا خاتمہ کیا جائے۔ نہیں چاہیے کہ ہم اقبال پر سید کی یا رحیم جیسی نظریں ڈالیں موجودہ صورت حال کو ہرگز نظر انداز نہ کریں۔ نظر خواہ سیدھی ہو یا ترچھی، مگر ایسا ہی ہو کہ کسی سے مستعار نہ ہو۔ نظر اگر ہماری اپنی ہوگی تو اقبال نہ فوق البشر معلوم ہوگا نہ معصوم عن الخطا بلکہ وہ زندگی کا ایک ممتاز خادم ہونے کی حیثیت سے ہر وقت اپنے ناقدین کے احتساب کا متحمل ہوگا۔ میرے نزدیک اقبال کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں

جامعہ کے لیل و نہار کا لب

نہایت اہم اور موثر قرار دیا اور بحر اسود ادب میں حفیظ میرٹھی کی شعری خدمات گنائیں خصوصاً دوام میں آپ کی شخصیت پر شائع ہونے والے مضمون کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ "جب حفیظ نے میدان تغزل میں قدم رکھا تو غزل بھی مسلمان ہو گئی"۔

بعد ازیں تو دوسرے طلباء نے بھی اس ادبی نشست میں حصہ لیا لیکن لوگ معروف جناب حفیظ صاحب ہی کے منتظر ہو رہے تھے اس نے بار بار اصرار کر کے آپ ہی کو سنا گیا۔ جناب حفیظ صاحب کے اصرار پر برادر راشد حامدی نے بھی اپنی غزل پیش کی۔

اگر یہ کہا جائے کہ جناب حفیظ صاحب کے ہر شعر میں مقصدیت اور پیام پایا جاتا ہے آپ کی ہر غزل سیاست و ادب کا بہترین امتزاج ہے، ہر شعر اپنے اندر معنی و مفہوم کے کئی افق لیے ہوئے ہے اور ہر شعر کوزے میں سمندر سمیٹنے کے مصداق ہے تو بیجا نہ ہوگا۔ ملاحظہ فرمائیے

چمن میں سب کی زباں پر تھی میری مظلومی
مرے خلاف جو بولا تو باغباں بولا
تمہارا جبر بھی زندہ بدن جلا کے گئے
کسی نے دم نہیں مارا مگر دھواں بولا
اثر ہوا تو یہ تقریر کا کمال نہیں !!
مرا خلوص مخاطب تھا میں کہاں بولا
اس دشمن ایماں نے کیا شیخ پہ جادو
کافر کو کہے ہے وہی دیندار کرے ہے
پے عقدہ اپنی کلیسی ہو تو کہو !
وقت کے فرعون سے ڈر جائیں کیا
شیخ قاتل کو مسیحا کہہ گئے
محترم کی بات کو جھٹلائیں کیا
اب اہل کارواں پہ لگا ہے یہ تہمتیں
وہ ہم سفر جو چلتے چلتے میں سو گیا
میدان کارزار میں آئے وہ قوم کیا
جس کا جوان آئینہ خانے میں رہ گیا
وہ وقت کا جہاز تھا کرتا لحاظ کیا
میں دوستوں سے ہاتھ ملانے میں رہ گیا

اس طرح یہ نشست اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ بارہ بجے تک چلتی رہی۔ معزز مہمان نے ناسازی طبع کے باوجود ہم طلبہ کی خواہشات و جذبات کا پورا لحاظ کیا اور ہماری تمام ہی فرمائشوں اور مطالبات کو پورا کرنے کی کوشش کی۔

مولانا عبد الحکیم ایم اے بی ایڈ

قصۂ پارینہ

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے ۲۰ مارچ ۱۹۵۸ء کی شب میں سبزی منڈی حال اعظم گڈھ میں قبل نمازِ عشاء ایک تقریر ارشاد فرمائی۔ حاضرین کی تعداد کم و بیش پانچ سو تھی۔ دورانِ تقریر میں نوٹس نہیں لئے گئے تھے۔ تقریر کے خاتمہ پر محض یادداشت سے اسے مرتب کیا گیا ہے۔ مولانا نہایت وجیہ، متین اور پروقار شخصیت کے مالک ہیں۔ تقریر میں بڑی بے ساختگی، دلسوزی اور دلنوازی سی تھی۔ مجمع میں بعض لوگ آبدیدہ ہوگئے۔ اندازِ خطاب ایسا تھا جیسے پورے مجمع میں کسی کو اپنا ہمدرد و ہم خیال نہیں پاتے اور اجنبیوں سے گفتگو کر رہے ہیں۔

برادرانِ عزیز!

میں آپ کی اس بستی میں پہلی مرتبہ آیا ہوں۔ ضروری ہے کہ میں اپنا تعارف خود کراؤں۔ اسلام سے محبت، انگریز دشمنی، نوکری سے گریز اور اخلاص میرے خاندان کی خصوصیات رہی ہیں۔ میرے پردادا مرحوم ۱۸۵۷ء کے غدر میں اپنے چار بیٹوں کے ساتھ انگریزوں سے لڑے تھے۔ دادا مرحوم کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ خربوزے کی قاشیں معہ چھلکوں کے کھاتے تھے۔ اخلاص اور سادگی کی بنا پر وہ ایسا کرتے تھے۔ یہ میرے سامنے کی بات ہے کہ ایک انگریز افسر ہمارے گھر پر آیا اور دروازے پر کھڑے ہو کر دادا مرحوم سے کہا کہ ہم آپ کو پچاس مربع اراضی لائل پور میں دینا چاہتے ہیں، قبول کر لیجئے۔ یہ سن کر انھوں نے حاضرینِ مجلس سے کہا کہ اس فرنگی سے کہو یہاں سے نکل جائے۔ ان کے ہزاروں شاگرد اور مرید تھے۔ امیر دوست محمد خاں والی کابل ان کے مرید تھے۔ میں خود ایک خانہ خراب انسان ہوں۔ گھر ہی نہیں تباہ ہوا بلکہ بزرگوں کی قبریں بھی کھودی جا چکی ہیں۔ میری ایک لڑکی [illegible] گئی ہیں۔ تاہم میں آپ سے شکوہ نہیں کرتا۔ کسی ہندو پر الزام نہیں۔ کسی پاکستان سے مدد کا خواستگار نہیں۔ نہ حکومت سے کوئی امید وابستہ نہیں۔

برادرانِ عزیز! مجھے یہ کہنا ہے کہ اس ملک کی جنگِ آزادی میں ہمارا حصہ کسی سے کم نہیں۔ میں دس سال تک جیل میں رہا ہوں۔ میرے خاندان کے کل افراد نے آزادی کی لڑائی لڑتے جرم میں عمر عزیز کے پچاس قیمتی سال جیل کی چہار دیواریوں کے اندر گزارے ہیں۔ ہم کسی پر اس کا احسان نہیں رکھتے، نہ کسی ہندو پر نہ کسی مسلمان پر۔ اور تقسیم کے بعد جو کچھ ہم پر گزری ہم اس کا شکوہ نہیں کرتے۔ ایسا ہونا ہی تھا۔ ہمیں یہ بات پہلے سے معلوم تھی۔ چنانچہ میرے والد مرحوم نے اپنے خیالات کا اظہار بہت پہلے کر دیا تھا۔ ہم کسی کے سامنے اپنا دکھڑا کیا روئیں۔ ہندو شرنارتھی پاکستان سے یہاں آئے۔ چالیس کروڑ ہندوؤں میں سے کسی کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ وہ ان سے کہتا کہ آؤ تم بے خانماں ہو، مصیبت زدہ اور بے روزگار ہو، میرے مکان پر میرے پاس ٹھہرو، میں تمہیں دو سال اپنے پاس رکھوں گا، میں تمہاری ضروریات کا کفیل ہوں گا۔ مجھے ملک کے ان چالیس کروڑ ہندوؤں میں سے کوئی ہندو ایسا نظر نہیں آتا، کوئی ہندو دلوں کا غمگسار اور ہمدرد دکھائی نہیں دیتا اور اگر کوئی ہو تو ہمارے سامنے آئے، میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہ بات تو نہیں کہ چالیس کروڑ میں سب کے سب بھٹک گئے ہوں گے۔ سب سمجھتے ہیں یہ کام حکومت کا ہے۔ حکومت کرے، ہم کو کیا پڑی ہے دردِ سری مول لینے کی۔ حالانکہ حکومت کیا چیز ہے، عوام

ان کا یہ فرض ہے جو چپ ہیں تاکہ ملک کا اندرونی نظم و نسق درست رہے اور ملک دوبارہ غلامی کی لعنت میں گرفتار نہ ہونے پائے۔ پھر وہاں پاکستان کا کیا حال ہے کیا وہاں مہاجرین کو پناہ مل گئی ہے نہیں۔ وہ روز رو رہے ہیں مسلمانوں نے مسلمان بہو بیٹیوں کے ساتھ منہ کالا کیا وہ ان کو روٹی نہیں دے سکے اپنی خوشیوں کی قیمت ادا کر سکے۔ مسلمانوں کا یہ حال ہے اور ہندو کا وہ ہے

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

سب کو اپنی اپنی پڑی ہے زیادہ سے زیادہ کپڑا چاہیے، روٹی چاہیے چینی اور پٹرول چاہیے، پرمٹ اور مراعات چاہئیں۔ لوگ ان چیزوں کے پیچھے دیوانہ ہو گئے ہیں حکومت کو گالیاں دی جاتی ہیں میرے ایک عزیز دوست نے کہا کہ مولانا صاحب یہ جواہر لال تو بڑا بے ایمان نکلا۔ غلہ مہنگا کپڑا نایاب، آئے دن کی مصیبت۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ روپیہ میں ایک سیر آٹا مجھے منظور ہے، تنگی و افلاس منظور ہے، دقت اور پریشانی منظور ہے لیکن انگریزوں اور امریکہ والوں کی سرپرستی منظور نہیں ہے۔ ہم انگریزوں اور امریکہ کو ہندوستان میں اڈے نہیں دینا چاہتے وہ تو یہ چاہتے کہ جواہر لال نے چین کا ساتھ دیا اور شمالی کوریا کی ورنہ کون کہہ سکتا ہے کہ تیسری جنگ کے بعد دنیا کا کیا حشر ہوگا۔ انگریز نہیں چاہتے امریکہ قطعاً پسند نہیں کرتا کہ ہندوستان آزادی کی نعمتوں سے فائدہ اٹھائے اور انہیں معلوم ہے کہ ہندوستان کی ترقی میں ہندوستانیوں کی کوششیں ہیں اور ہندوستان کی سربلندی میں یورپ و امریکہ کی موت ہے امپیریلزم اور سامراجیت کی موت ہے۔ اہل نظر اس حقیقت کو سمجھتے ہیں۔ نہرو اس حقیقت سے باخبر ہے لیکن عوام الناس اور بعض سیاست کے دم چھلے بنے ہوئے جنہیں انگریزی دور میں مجال گفتگو نہ تھی۔ آج حکومت کو، کانگریس کو، نہرو کو بدنام کرتے ہیں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ اور بات صرف اسی قدر ہے کہ کپڑا نہیں ملتا، چینی اور شکر نہیں ملتی۔ پرمٹ اور مراعات نہیں دی جاتیں۔ مجھے سیدھی بات بتاؤ تمہیں یہ چیزیں عزیز ہیں یا آزادی؟ نہیں یہ ساری چیزیں مل سکتی ہیں اور بمقدار وافر مل سکتی ہیں بس آزادی کھونا پڑے گا کہ انگریزوں کو اپنے ملک میں اڈے دو اور پھر سے اپنے کو ان کے ہاتھ بیچ دو، موج اڑانے کو مل جائے گا۔

صاف ہوا یہ جمہوری دور ہے جنگ آزادی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے وہ تو ابھی جاری ہے لیکن میں دیکھتا ہوں کہ اصل حقیقت پر نظر کسی کی نہیں ہے۔ مسلمانوں کو یہ شکایت ہے کہ ان کے ساتھ زیادتی کا سلوک ہوتا ہے مسجدیں ان کی مندروں میں تبدیل کی جا رہی ہیں ان کے حقوق ان کی جائداد ان کی آبرو کوئی چیز بھی محفوظ نہیں ہے لیکن میں ان سے کہتا ہوں کہ خبردار زبان شکوہ سے آشنا نہ ہو۔ یہ ملی زندگی کا دور ہے ملی زندگی یہیں چلے گی۔ تمہیں سب کچھ انگیز کرنا پڑے گا۔ تمہیں یہیں رہنا اور یہیں مرنا ہے۔ میں ہندوؤں کو خوب جانتا ہوں میں نے ہندوؤں میں نمازیں ادا کی ہیں گردواروں میں رہا ہوں میں ان کی رگ رگ سے واقف ہوں بس یہ وقت ہے سب کچھ جھیل جانے کا۔ تعلقی نکلی جا رہی ہیں تم نہ کرو مسلمانوں کے لیے یہ ترقی نہیں مسجد ہے۔ سالی کے مسلمانوں نے سمجھ لیا کہ ہندو چاہتا ہے کہ ہمیں مزدور بنا کر چھوڑے میں نے کہا یہ نہیں ہو سکتا تم مزدوری نہیں سمجھتے، جانتے ہو مزدور کسے کہتے ہیں مزدور وہ ہے جو محنت و مشقت کرکے حلال روزی پیدا کرتا ہے۔ مزدور وہ تھے جو وطن چھوڑ کر مدینہ آگئے اور لوگوں سے مدد کی درخواست کے بجائے بازار کا راستہ پوچھا اور وہیں محنت و مشقت کرکے حلال روزی پیدا کی اور کسی کا دست نگر بننا گوارا نہ کیا۔ تم میں کہاں ہمت ہے مزدور بننے کی۔ اور اگر کبھی تم صحیح معنوں میں مزدوری سیکھو تو میں پورے وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ پھر یہ ہندوستان تمہارا ہے تم اس کے اصلی مالک ہو سب تمہارے خادم ہوں گے۔

مسلمانوں سے میں خصوصیت کے ساتھ کہتا ہوں تمہیں تقویٰ اور پاکبازی کا ایک ایسا عملی نمونہ ہونا چاہیے کہ یہی ہندو بھی تمہاری پاکبازی کی شہادت دیں۔ جو ٹھگا کر تمہارے منہ سے دعا نکلنی چاہیے مجھ کو دیکھو میں سکھوں کیلئے اور ہندوؤں کیلئے دعا کرتا ہوں اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت عطا فرمائے۔

ہندوؤں سے اور حکومت سے کچھ بھی طلب نہ کرو۔ نشستوں کیلئے عہدوں اور ملازمتوں کیلئے حقوق اور مراعات کیلئے لڑائی مت لڑو ان سب سے قطعاً دست بردار ہو جاؤ۔ یقین رکھو کہ ہندوستان کی آبرو تم ہو سمجھ کر دو کہ تمہیں یہاں سے ٹلنا نہیں ہے۔ تم اپنے طرز عمل سے اپنے اخلاق کی بلندی سے اپنے کردار سے اس ملک کو جیت سکتے ہو

تبصرہ

مولانا ایک ایسے خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں جو علم و فضل میں پورے ملک میں ممتاز رہا ہے۔ اپنے ملک کی خاطر اس خاندان کے ایک ایک فرد کی قربانیاں حیرت انگیز ہیں۔ بعض زنجیروں میں جکڑا گیا اور آگ میں تپایا گیا ہے لیکن ان کے پائے ثبات کو لغزش نہیں ہوئی۔ خود مولانا پر جو کچھ گذر گئی وہ سب کے سامنے ہے ایک لاکھ کتابوں کا نذر آتش ہو جانا کسی ایک شخص یا خاندان ہی کا نقصان نہیں ہے بلکہ پوری قوم کے لئے دردانگیز حادثہ ہے۔ ان کڑی آزمائشوں اور امتحانات کے باوجود وہ اسی پرانی پامردی کے ساتھ قائم ہیں جیسے تقسیم سے پہلے تھے۔

لیکن اگر یہ صحیح ہے کہ "درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے" تو ہمیں اس سلسلے میں کچھ عرض کرنا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جس مسلک کی محبت اور جس نصب العین کی خدمت میں مولانا نے اپنا سب کچھ کھو دیا ہے۔ اس نے ہمیں کیا دیا اور آئندہ کیا کچھ دے سکتا ہے؟ حصول آزادی کے بعد معلوم ہوا کہ اس ملک میں انسان نہیں درندے اور خونخوار بھیڑیے بستے ہیں وہ اخلاقی و روحانی اعتبار سے اس قعر مذلت میں جا گرے ہیں جس کے بعد پستی کا شاید کوئی اور درجہ باقی نہیں رہتا۔ خود مولانا کے بیان کے مطابق چھبیس کروڑ ہندوؤں میں ان کو واقعی "ہندو" کوئی نہیں ملا۔ ایسا ہندو جس کے سینے میں پتھر کے بجائے دل ہو جس میں انسانیت، ہمدردی اور غمخواری ہو۔ پھر مسلمانوں کو کوئی دیکھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا وجود خود اسلام کے خلاف ایک چیلنج ہے۔ غرض یہ ہے کہ آزادی تو ملی مگر وہ ہندو کہاں اور وہ مسلمان کہاں جو آزادی کی قدر کرتے اس کی ذمہ داریوں کو سمجھتے اور اپنے فرائض انجام دیتے۔ ہماری تو قمر رگئی لیکن ہیرو کو بھی ساتھ لیتی گئی۔ پھر یہ کہ گذشتہ میں جو کچھ ہوا اب نہیں کہہ سکتے کہ کل پھر وہی نہیں ہو سکتا۔ درندے آخر کیا نہیں کر سکتے؟ صرف موقع ملنے کی دیر ہے اور اگر آپ ذرا نظر تامل سے دیکھیں تو وہ سب کچھ آپ کی نگاہوں کے سامنے ہوگا۔ یہ اس میں پاکستان اور ہندوستان کی قید نہیں جسے انسانیت کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ کہنا چاہئے۔ یہ حاصل ہے پچھلی مساعی کا گذشتہ قربانیوں اور جاں سپاریوں کا۔ کیا ان سب واقعات کی روشنی میں اپنے مسلک پر نظر ثانی کر لینا بہتر ہو گا؟

بڑی مشکل یہ آپڑی ہے کہ وہ لوگ اصلاحی تاریخ سے کھیلتے ہیں یہ بڑا دردانگیز مذاق ہے۔ کوئی سنجیدگی سے غور نہیں کرتا کہ ملکی زندگی کیا تھی

فقر و فاقہ، مزدوری اور دکھ بجائے خود مطلوب و محبوب نہیں ہیں۔ ملکی زندگی ہو یا ملی، کمل نصب العین اعلائے کلمۃ اللہ اور اقامت دین کے سوا اور کچھ نہ تھا اور ہم سب کا ایمان ہے کہ یہی نصب العین ہے جس کا عشق اور جس کی خدمت ہم سب کو ہلاکت و تباہی سے بچا سکتی ہے۔ مسلمانوں کو بچا سکتی ہے۔ ہندوؤں کو بچا سکتی ہے اور ہمارے ملک کو بہترین ترقی کی راہ پر لگا سکتی ہے۔ نصب العین کو بھلا کر، منزل سے منہ موڑ کر جو بھی قدم اٹھے گا، جو کوشش بھی ہو گی جو قربانی بھی دی جائے گی، نہ صرف یہ کہ بے نتیجہ رہے گی بلکہ الٹا اثر دکھائے گی بس ضروری ہے کہ فقر و فاقہ ہو، مزدوری و جفاکشی ہو، چوٹ اور دکھ ہو، جان و مال کی قربانی ہو مگر جو کچھ ہو سب ایک مقصد کے حصول کیلئے ہو۔ اب حال یہ ہے کہ پوری امت اپنے موقف سے اجنبی ہو گئی ہے اس کا بگاڑ بہت پرانا ہو چکا ہے۔ نہایت زبردست عوامل ہیں جنہوں نے صحیح سمت سے امت کا رخ پھیر رکھا ہے لیکن یہ ممکن ہی نہیں کہ آنکھیں بند کر کے کسی بھی راہ میں ڈال دیں اور پھر بہ توفیق بھاگ کر اور دعا مانگ کے منزل تک پہونچ جائیں۔

مولانا نے دوران تقریر لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا "اصلح سریرتی اللہ عملکم" کیا یہ ضروری نہیں کہ اس آیت کی روشنی میں ہم اپنے اگلے پچھلے اعمال کا جائزہ لیں قبل اس کے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش کئے جائیں۔

مولانا نے مسائل عرب، اردو ہندی وغیرہ کے بارے میں بھی کچھ باتیں ارشاد فرمائی تھیں لیکن چونکہ وہ اصل موضوع سے ایک ذرا بے تعلق سی تھیں اس لئے ان کو نظر انداز کیا جا رہا ہے ایک اور بات جو قابل لحاظ ہے وہ یہ کہ اگرچہ مولانا مدعی ہیں کہ وہ کسی پر الزام نہیں رکھتے اور نہ کسی پر طنز کرتے ہیں لیکن ان کی ساری تقریر میں شکوہ اور طنز کی روح کار فرما ہے۔ یہ تضاد مولانا کے شایان شان نظر نہیں آیا۔

نوجوانوں سے خطاب

از
مجیب اللہ خاں

ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

شمع کی طرح جئیں بزم گہہ عالم میں
خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کریں

زندگی روز اول سے ہی وحدت اور وجود کی جستجو میں رواں دواں ہے۔ یہ پابند زماں و مکاں نہیں۔ زندگی کو کبھی قیام نہیں ہے۔ حرکت ہی اس کی روح رواں ہے۔ اور جمود اس کی موت ہے جمود در اصل وجود کی نفی ہے۔ زندگی کی روح کو کبھی پیمانۂ ماہ و سال سے ناپا نہیں جا سکتا۔ وجود انسانی ہر لحظہ "خودی" کے پردے میں اس کی مظہر ہے یہ ہمارا حرف متحرک قوموں کا ہے۔ جمود اور تعطل کی شکار قومیں ہمیشہ تاریخ کے پردے سے گم ہو کر اپنا وجود کھو بیٹھتی ہیں۔

کسی بھی ملک و ملت کا سب سے بڑا سرمایہ اس ملک و ملت کے نوجوان ہی ہوا کرتے ہیں۔ انقلاب زمانہ کی آبیاری انھیں کی گرمیٔ افکار اور ان کے خون جگر سے ہوا کرتی ہے۔ حیات نو کی کلی انھیں کے شباب، غازیانہ کردار اور حرب کاری سے گلنار ہوتی ہے۔ لیکن آج تمہارا حال ہی ایک گم شدہ کارواں کا سا ہے۔ تم جہاں آوری کے گر و کمند ڈالنے والے اور انھیں مسخر کرنے والے کہاں ہو گیا تمہارا شعور بیداری اور کس لئے تم آج جہاں آوری کی گرفت میں آ گرا اپنے اسلاف کے ورثہ اور امانت کی حرمت سے غافل ہو کے امانت میں خیانت کرنے لگے۔ تمہیں خلیفہ کا لقب دیا گیا تھا اور تم نے اس جہان رنگ و بو کو فساد کی آلائش کے لئے کھلا چھوڑ دیا۔ دنیا بھٹک رہی تھی، غلط راہ پر جا رہی تھی اور اب تک چلی جا رہی ہے۔ دنیا نے تمہیں سیاہ کے پردے میں بے شمار بت تراش لئے اور انھیں آئین جہاں کا نام دے دیا۔ تم امین تھے اور انشاء اللہ امین رہو گے لیکن ان امانتوں کا شکار ہو کر تم دانستہ طور پر بے حسی سے بہت دور بت پرستی میں مبتلا ہو گئے ہو جبکہ تمہیں یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتان آذری

عزیزو! تم نے تن من، دھن کو خس و خاشاک کی طرح باطل کے سیل رواں میں بہہ جانے دیا اور اس طرح تم اپنی عظمت کھو بیٹھے یہی نہیں کہ عظمت گئی بلکہ آج تو زندگی کی لوائیں بھی برخاست اور شعلہ بار ہو گئی ہیں۔ صحن حرم کی پاکیزگی خود ہمارے اپنے ہاتھوں سے آلودہ ہو چکی ہے سوچو تو سہی کہ بے راہ روی کی کس منزل پر تم بھٹک رہے ہو۔

دنیا تمہارے لئے ارد پرستی کی چیز ہرگز نہ تھی۔ ہونا تو یہ تھا کہ تم بجائے دنیا میں گم ہونے کے اس کو خود اپنے میں گم کر دیتے کہ تمہاری پہچان ہی تھی یہ

مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

تمہیں تو اس ہنگامۂ زندگی کو روحانیت، مذہبیت سے جگانا تھا بھٹکی ہوئی انسانیت کو صراط مستقیم پر چلانا تھا۔ کہ خواب غفلت

میں مبتلا ہو کر تباہی اور بربادی کی آگ کو جلا رہی تھی۔ ابھی پانی کا سر سے
اونچا نہیں ہوا ہے۔ تم ذرا سر تو اٹھاؤ، اپنی عظمت کو پہچانو، اپنی تاریخ
پر نظر ڈالو اور گمراہی کے بت کو مسمار کر دو۔۔۔ یہ مت بھولو کہ وہ تمہیں
ہو جس نے طاغوت سے ٹکر لی تھی اور اس کے در و بام کو ہلا کر رکھ دیا تھا
وہ تمہیں تو تھے جس نے قیصر و کسریٰ کو زیر کیا تھا اور وہ تمہیں تو تھے
جس نے اپنے کردار کی عظمت کا سکہ سارے عرب و عجم میں جما دیا تھا۔
آج دنیا تاریکیوں میں بھٹک رہی ہے، روشنی کے لئے تڑپ
رہی ہے، زندگی تمہارے لئے پیچ و تاب کھا رہی ہے۔ تم ذرا اپنے
کارناموں پر نظر ڈالو۔ ع

جہاں جا کے ہم نے اذان دی، وہاں آج تک بھی گونج ہے

قدم اٹھاؤ۔ راہ خدا میں مجاہد بن کر نکل پڑو۔ منزلیں تمہاری
منتظر ہیں۔ راستے خود بخود طے ہو جائیں گے، شان یہ ابھی سہارا دیگی،
صدیق نقیب ہوگا، عظمت عمر پشت پناہی کرے گی، عثمان کی نرمی اور
ذوالفقار کی سرگرمی ہوگی، اور اگر اس کارزار حیات کو ضرورت پڑی
تو عزم حسین بھی ہوگا جس سے بڑھ کر اب اس دنیا میں کوئی کر جائیگا

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

مومن کی زندگی کا یہی مقصد اول اور یہی مقصود آخر بھی ہے۔
عزیزو ذرا سوچو تو سہی کہ تمہارے لئے راہ میں کتنے رہنما ہوں گے
اور کتنی مشعل راہ ہوں گی اور ان سب کے علاوہ اللہ کی رحمت ہوگی جو

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ

پھر بھی کیا چاہئے اکس کی روشنی کیا الحمد رب العالمین نہیں ہے جو ...
... ستارہ روشن و ذروں کی انسانیت کشتی پر تیغ اتفاق ...
اسلام ... کی جواب ... اور کیا تمہارا ...
... قرآن روشنی کی ضمانت ہے۔ یہ حکمت بھری کتاب سے مطلوب ہے
پکڑے رہو۔ اسوۂ حسنہ تمہارے لئے رخت سفر ہے۔ امور خلافت
سنگ میل ہیں۔ تمہیں اول ہو تمہیں آخر ہو۔ آدم کو خلافت ارضی ملی تھی
تمہیں اولاد آدم ہو۔ اپنی محرومی کو آشکار کر دو، اپنی حقیقت کی طرف لوٹو

کہاں کھو گئے تم؟ اپنی اور مقابل اپنی شمائل ہیں۔ تم دنیا کو روشن کرنے والے
کہاں اور کب تاریکی سے بھٹکتے رہو گے۔ توڑ دو یہ سحر جو دیواریں۔ آج علم
و عمل کا سارا سرمایہ باطل کی کمائی بنا ہوا ہے۔ تم اس کی بلند و بالا عمارت
پر نظر جاؤ۔ ع

آگ بجھ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا

عزیزو صدائے شاعر مشرق تمہاری منتظر ہے۔ ع

شمع کی طرح جئیں بزم گہ عالم میں
خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

آپ کو مایوس ہونے کی ضرورت بالکل نہیں ہے۔ ابھی یہ زمین بہت
زرخیز ہے۔ حریت کی لو ابھی بھی پیام موجود ہے۔ تم تو صاحب بینا ہو ذرا آنکھ
تم کرو۔ خدا رحمن بھی رحیم بھی ہے۔ مایوسی سے ایمان میں خلل پڑتا ہے۔ تمہاری
ضرورت زوال علم و عرفان ہے بلکہ کفر بھی ہے۔ تم تو خدا کے راز دانوں
میں ہو۔ ع

امید مرد مومن ہے خدا کے راز دانوں میں

تمہاری رگوں میں اسلاف کا خون رقصاں ہے۔ تمہیں صرف
گہری افکار اور اندیشۂ بے باک پیدا کرنا ہے۔ تمہاری منزل یہ
ہرگز نہیں ہے جسمیں تم آج گم کردہ راہ ہو گئے ہو۔ تمہیں تو فضائے
بسیط میں کمندیں ڈالنا ہے۔ ابھی ع

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

یہ ارضی زندگی صرف راہ ہے اور راہ عمل ہے۔ منزل ہرگز نہیں ہے

اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
تمہارے زماں اور مکاں اور بھی ہیں

حصول مقصد کے لئے اگر ضرورت پڑے تو اپنی ہستی سے بھی کھیل
جاؤ۔ اسے مٹا دو کہ گزاری کا طریق کار یہی ہے۔ اب تم اپنے اس کھوئے مقام
کو دو۔ خودی اور خود داری کے کھو کو ترک کر دو اور اس مقام کی طرف اللہ
کا نام لے کر بڑھو جہاں خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے
حالانکہ حصول رضائے الٰہی مومن کا مقصد ہے۔

ابوسفیان اصلاحی

معروف و منکر

جب بھی برائیاں عام ہوئیں، ظلم و ستم روز مرہ کے معمول بن گئے، حق تلفی، خونریزی اور عصمت دری لوگوں کا شیوہ بن گئی، ہر طرف تاریکیوں اور ناانصافیوں کا قہر ٹوٹ پڑا تو خداوند قدوس نے اسے مٹانے کے لئے انبیاء و رسل مبعوث کئے جو بنی نوع انسان کو پیغام خداوندی اور صراط مستقیم کی دعوت دیتے اور تمام معاملات و مناکحات میں دامن انصاف کو مضبوطی سے پکڑے رہنے کی تاکید کرتے۔ انکی زندگی کا یہی مقصد قرار پایا کہ لوگوں کو ظلمتوں اور سیاہ گھاٹیوں سے نکال کر روشنی میں لائیں۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے۔

کتاب انزلناہ الیک لتخرج الناس من الظلمات الی النور (ابراہیم ۱)

یہ قرآن ایک کتاب ہے جسکو ہم نے آپ پر نازل کیا ہے کہ آپ تمام لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کیطرف لائیں۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اس وقت ہوئی جب سارا عرب قتل و غارتگری، ناانصافی و فریب دہی اور جبر و استبداد کی انتہا کو پہنچ چکا تھا، وہ مختلف گروہوں میں تقسیم ہو کر ایک دوسرے کو لوٹتے اور اسی میں اپنی عظمت و فوقیت تصور کرتے معمولی سی بات پر برسہا برس تلواریں چلتی رہتیں۔ قساوت قلبی کا یہ حال تھا کہ اپنی بچیوں کو زندہ درگور کرنے میں کوئی دریغ محسوس نہ کرتے ہم یہاں پر حضرت ابو جعفرؓ کی وہ تقریر جو انھوں نے شاہ نجاشی کے دربار میں کی تھی پیش کر رہے ہیں جس سے بخوبی اندازہ ہو جائیگا کہ اس وقت کیا صورت حال تھی

ایھا الملک کنا قوما اھل جاھلیۃ نعبد الاصنام ونأکل المیتۃ ونأتی الفواحش ونقطع الارحام ونسیئ الجوار ویأکل القوی منا الضعیف فکنا علی ذالک حتی بعث اللہ الینا رسولا منا نعرف نسبہ وصدقہ وامانتہ وعفافہ فدعانا الی اللہ لنوحدہ ونعبدہ ونخلع ما کنا نعبد نحن وآباءنا من دونہ من الحجارۃ والاوثان وامرنا بصدق الحدیث واداء الامانۃ وصلۃ الرحم وحسن الجوار والکف عن المحارم والدماء ونھانا عن الفحش وقول الزور واکل مال الیتیم وقذف المحصنۃ وامرنا ان

اے بادشاہ! ہم جاہل تھے بتوں کی پرستش کرتے تھے، مردار کھاتے تھے، برائیاں کرتے، قطع تعلقی کرتے، ہمسایوں کو ستاتے، ہمارا قوی ضعیف کا حق غصب کر لیتا، ایسی بدترین حالت میں اللہ تعالیٰ نے ہمارے اندر سے ایک رسول مبعوث کیا جس کے حسب نسب، سچائی، دیانتداری اور پاکیزگی سے ہم واقف تھے۔ اس نے ہمیں اللہ کی دعوت دی کہ اللہ ایک ہے اسی کی عبادت کریں، ماسوا اللہ تعالیٰ کے علاوہ جن کی ہم اور ہمارے آباء و اجداد عبادت کرتے تھے مثلاً پتھروں اور بتوں کو چھوڑ دیں۔ اس نے ہمیں سچائی، امانتداری، صلہ رحمی، پڑوسیوں سے اچھا سلوک کرنے کا حکم دیا، محارم اور خون سے بچنے کی تاکید کی۔ فواحش، جھوٹ بولنے، یتیم کا مال کھانے اور پاکباز عورت پر الزام بدکاری سے منع کیا۔ اس نے ہمیں تنہا اللہ کی عبادت بغیر کسی کو شریک ٹھہرائے، نماز پڑھنے، زکوٰۃ دینے اور روزہ رکھنے کا حکم دیا۔

لیعبدوا اللہ وحدہ ولا شریک
بہ شیئا واقیموا الصلوۃ و
الزکوۃ والصیام ۔

اس سے بتانا مقصود ہے کہ انبیاء ورسل معروف کو پھیلانے اور منکر سے روکنے کے لئے منجانب اللہ مبعوث کئے جاتے انبیاء ورسل کی پوری زندگی "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" سے عبارت ہوتی ہے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم آخری پیغمبر ہیں اب کوئی رسول یا نبی نہیں آئے گا دین اسلام مکمل ہو چکا۔ ایک ایک باتیں کھلکر سامنے آگئیں قرآن کریم میں ارشاد ہے۔

"الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام" (مائدہ ۳)

آج کے دن تمہارے لئے تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا اور میں نے تم پر اپنا انعام تمام کر دیا اور میں نے اسلام کو تمہارا دین پسند کیا۔

دین مکمل ہو چکا اور ہم پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرو ٹھہرے تو ہمارا فرض ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے نقش قدم پر چلیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی باتوں کو پھیلائیں، لوگوں کو دعوت توحید دیں اور اسلامی تعلیمات سے لوگوں کو روشناس کریں۔ ہماری محض یہی ذمہ داری نہیں کہ عبادت وریاضت میں ہر وقت منہمک رہیں، لوگوں سے کوئی رشتہ نہ ہو تو ہمارا وہی حال ہوگا جو دین مسیحی کے ساتھ پیش آیا ان کے علماء عوام سے الگ گرجا گھروں میں بیٹھے رہتے نجات کا راستہ ان کے یہاں رہبانیت قرار پایا جس کی بناء پر لوگ مذہب سے بیزار ہو گئے اور مذہب کو "افیون کی گولی" سے تعبیر کیا۔ ہمارا مذہب رہبانیت کا شدید مخالف ہے قرآن کریم میں ارشاد ہے۔

ورھبانیۃ ن ابتدعوھا ما کتبناھا علیھم الا ابتغاء رضوان اللہ فما رعوھا حق رعایتھا

اور انھوں نے رہبانیت کو خود ایجاد کیا تھا ہم نے اس کو ان پر واجب نہ کیا تھا لیکن انھوں نے حق تعالیٰ کی رضا کے واسطے اس کو اختیار کیا تھا سو انھوں نے اس کی پوری رعایت نہ کی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کی زندگیاں اس باب میں نمونہ ہیں انھوں نے ہمیشہ معروف کا حکم دیئے اور برائیوں سے روکنے کی کوئی کسر نہیں باقی رکھی۔ مانعین زکوٰۃ کا واقعہ کتنا اہم ہے اس وقت حالات کی سنگینی کو مد نظر رکھتے ہوئے حضرت عمر و دیگر صحابہ کرام نے یہ رائے دی تھی کہ اس وقت چاروں طرف لاوا پھوٹ رہے ہیں بہتر یہ ہے کہ ان سے کوئی چھیڑ چھاڑ نہ کی جائے حضرت ابوبکرؓ نے ایک نہ سنی اور فرمایا کہ یہ دین کا اہم فریضہ ہے میں ضرور ان سے جنگ کروں گا حتی کہ انھوں نے "عقال" دینے سے بھی اعراض کیا تو پھر بھی میں انھیں درگذر نہیں کر سکتا۔ ایسے ہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اگر فاطمہ بھی چوری کرے تو میں اس کا بھی ہاتھ قلم کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں کروں گا" نیز ایسے ہی حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے پر شراب پینے کی بناء پر حد جاری کی ایسے نہ جانے کتنے واقعے ملیں گے سب میں یہی جذبہ کارفرما ہے کہ معروف کا بول بالا ہو اور منکر کا وجود نا پید ہو جائے۔ اسلامی عدالت میں اعزا و اقارب کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا بلکہ دیکھا جاتا کہ یہاں پر اسلام کا کیا حکم ہے قرآن کریم میں ارشاد ہے۔

"ولا یجرمنکم شنآن قوم علی الا تعدلوا" (مائدہ ۸)

اور کسی خاص قوم کی عداوت تمہارے لئے اس کا باعث نہ ہو جائے کہ تم عدل نہ کرو۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے۔

واذا قلتم فاعدلوا ولو کان ذا قربی (۱۵۲ انعام)

اور جب تم بات کیا کرو تو انصاف رکھا کرو گو وہ شخص رشتہ دار ہی ہو۔

قرآن کریم کی تمام سورتوں اور بیشتر احادیث میں صراحت کے ساتھ موجود ہے کہ ہر دور میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام جاری رہا اس کے لئے کوئی مدت اور قید نہیں ہے قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینھون عن المنکر واولئک ھم المفلحون (آل عمران)

اور تم میں ایک ایسی جماعت ہونا ضروری ہے کہ خیر کی طرف بلایا کریں اور نیک کاموں کے کرنے کو کہا کریں اور برے کاموں سے روکا کریں اور ایسے

یہی لوگ پورے کامیاب ہوں گے۔

اس آیت سے یہ بات سامنے آتی کہ مسلمانوں میں ایک ایسی جماعت ہو جو بھلائیوں کا حکم اور برائیوں سے روکنے کی جماعت کی تاکید اس لئے آئی کہ اگر سارے لوگ اس کام میں مصروف ہو گئے تو کاروبار زندگی ٹھپ پڑ جائے گا اور اہل دنیا ان کاموں سے نہ بچیں گے یہ نظریہ اسلام کس قدر اعتدال کا حامل ہے۔ ایک دوسری جگہ قرآن میں وارد ہے۔

كنتم خير امة اخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنكر (آل عمران ۱۱۰)

تم لوگ بہترین جماعت ہو کہ وہ جماعت لوگوں کیلئے ظاہر کی گئی ہے تم لوگ نیک کاموں کو بتلاتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو۔

اس آیت سے واضح ہو گیا کہ ہمارا مقام دنیا کی ساری قوموں سے بلند ہے لیکن اس بلندی کے ساتھ ساتھ ذمہ داریاں بھی اہم ہیں۔ ہمیں دنیا میں وجود اور کتاب ہدایت اس لئے عطا کی گئی ہے کہ لوگوں کو شر و فساد سے احتراز کرنے، بتوں کی پرستش ترک کرنے کی دعوت دیں اور ان کے دلوں سے دنیا کی محبت نکال کر خداوند قدوس کی محبت و عقیدت بھر دیں۔ ان کا جینا اور مرنا، ان کا چلنا اور پھرنا، ان کا بیٹھنا اور اٹھنا غرضیکہ زندگی کے تمام شعبوں میں مشیت ایزدی کے احکام جاری و ساری ہوں۔

ہمیں دنیا میں گواہ، نگران اور حقیقی نائب بنایا گیا ہے قرآن کریم میں ارشاد خداوندی ہے

واذ قال ربك للملائكة انى جاعل فى الارض خليفة

اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ یقیناً میں زمین پر ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

خلیفہ کے معنی حقیقی معنی مختلف فیہ ہیں لغوی معنی "قائم مقام" کے ہوتے ہیں یعنی کوئی اپنی جگہ کسی کو متعین کرے جو پوری طرح اس کے بتائے ہوئے قوانین کی اتباع کرے۔ جب ہم اس کے نائب ٹھہرے تو ظاہر ہے کہ دنیا میں ہمیں وہی کچھ کرنا اور انجام دینا ہوگا جس کا حکم خداوند قدوس کی طرف سے ہو۔ اب جہاں ہم نے سر مو بھی انحراف کیا تو خلیفہ کہے جانے کے ہرگز مستحق نہیں قرار پائیں گے۔ دنیا میں ہمارے سامنے نہایت واضح مثال ہے کہ ایک گنہگار نائب نے اگر ذرہ برابر بھی اس کے حکموں سے سرتابی کی تو حضور کے پیشوا سے یہ بات باہر ہے کہ اسے نائب رہنے دے بلکہ اسے چشم زدن میں معطل کر دے گا اور یہاں تو اس کی بات دنیا کے اس حد سے کہیں بڑھ کر ہے۔ ہر فرد اور ہر مجموعہ جماعت کی ذمہ داری ہے کہ اس کی ایک ایک باتوں کو لوگوں کے اذہان و قلوب میں اتارنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ قرآن کریم میں ایک دوسری جگہ ارشاد ربانی ہے۔

وكذلك جعلناكم امة وسطا لتكونوا شهداء على الناس ويكون الرسول عليكم شهيدا (البقرہ ۱۴۳)

اور اسی طرح ہم نے تم کو امت وسط بنایا تا کہ تم لوگوں کو دین بتانے والے بن جاؤ اور رسول تم کو بتانے والے ہوں۔

لفظ "شہید" کے لغوی معنی الذی لا یغیب شئ عن علمہ کے ہوتے ہیں اس سے یہ بات نکلی کہ ہم لوگوں کے محافظ قرار پائے ہمارا فرض ہے کہ انہیں تاریکیوں میں بھٹکنے اور ضلالت و معصیت کے غار میں گر جانے سے محفوظ رکھیں، ان کے دلوں کو نور ایمان سے بھر دیں اور بتوں اور شجر و حجر کی عقیدت ان کے قلوب سے نکال پھینکیں۔

بیشمار احادیث ایسی موجود ہیں جس میں خوب شرح و بسط کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر امت مسلمہ کو اکسایا گیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم زندگی کے ہر موڑ پر لوگوں کو معروف کو پھیلانے اور برائیوں سے دور رہنے کی تاکید کرتے۔ برائی خواہ کتنی ہی حقیر کیوں نہ ہو اسے یہ سمجھ کر فراموش نہیں کر دینا چاہیئے کہ اس سے کیا ہو گا؟ ہرگز نہیں چھوٹے ہی گناہ بڑے گناہ کیلئے ممد و معاون ہیں سرایت کر جانے کا دروازہ بنتے ہیں۔ اکثر ہوا ہے کہ چھوٹی چھوٹی تفصیلات اسی طرح بنتی ہیں اور چھوٹی ہی چھوٹی بوندیں سمندر کو بھر دیتی ہیں یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر چھوٹے بڑے منکر کو ہمیشہ نابود کرنے کی تلقین کی۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول کس قدر پر حکمت ہے "اللہ کے حدود توڑنے والوں اور قائم کرنے والوں کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی قوم کسی جہاز پر سوار ہوئی ہو کچھ لوگ اوپر چلے گئے اور کچھ لوگ نیچے چلے گئے، جب نیچے والے اوپر والوں سے کہنے لگے ہم تو اپنے حصہ میں سوراخ کر رہے ہیں اوپر والوں کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائیں گے۔ اب اگر اوپر والوں نے ان کو ارادہ سے نہ روکا تو سب ہی ہلاک ہو جائیں گے لیکن اوپر والوں نے اگر ان کے ہاتھ پکڑ لیے تو سب بچ جائیں گے"

مذکورہ بالا حدیث سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ سوسائٹی میں کوئی بھی برائی پنپنے نہ پائے کیونکہ اگر اسے برگ و بار لانے کا موقع مل گیا تو اسی ایک کے بدولت رفتہ رفتہ پورا معاشرہ آلودۂ گناہ ہو کر رہے گا۔ درحقیقت سوراخ نیچے والے ہی بنا رہے تھے، اوپر والوں کا اس سے کوئی واسطہ نہ تھا، مگر ایک کی کرنی پر سبھوں کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا۔ دعوتِ حق کی راہ نہایت کٹھن اور پرخطر ہے۔ اسے شدائد و آلام و مصائب کا سامنا اور سخت ترین گھاٹیوں سے گزرنا ہوگا لیکن الٹے پاؤں میدانِ جہاد سے بھاگ جانا ایک مومن کا کام نہیں بلکہ آخری وقت تک میدانِ کارزار میں ڈٹا رہنا، قدم جمائے رہنا یا تو وہ شہید ہو کر اپنے ربِ حقیقی سے جا ملے یا غازی ہو کر اپنے گھر لوٹے۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم جب طائف گئے اور انہیں دعوتِ توحید دینا شروع کیا تو سارے امراء و رؤساء نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مجنون کہا، ایک نہ سنی۔ اپنے شہر کے اوباشوں اور غلاموں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے لگا دیا۔ حضور پر اس قدر پتھر برسائے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خون سے تر بتر ہو گئے، خون بہہ بہہ کر جوتے میں جم گیا، وضو کے لیے جوتے سے پیر نکالنا محال ہو گیا۔ جبرئیل امین آئے اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے اگر آپ حکم دیں تو مقام مردہ کی پہاڑیوں کو ملا دیا جائے تاکہ سب کے سب پس جائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "نہیں میری قوم جانتی نہیں ہے۔ مجھے پہچانتی نہیں، اگر یہ ایمان نہ لائے تو ان کی اولاد ایمان لائے گی" یہاں پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس شفقت و رحمت کا اظہار کیا ہمارے لیے درسِ عبرت ہے۔

دعوتِ توحید دینے والوں کے سامنے یہ اصول ہو کہ راہِ حق میں جو کچھ پیش آئے اسے برداشت کر لیا جائے، خداوند قدوس کے پیغام رسانی میں آلام و مصائب کے سر پہ لگنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہ کی جائے بلکہ ایک مومن کے یہ جذبات ہوں کہ اگر فی سبیل اللہ جان پیش کرنے کی نوبت آئے تو پشت نہ پھیرے۔ صحابی رضی اللہ عنہ کا وہ واقعہ سامنے رکھئے کہ دایاں ہاتھ کٹا، بایاں کٹا اس کے بعد بھی علم سینے سے لگائے رہے اور مرتے دم تک جھنڈے کو سرنگوں نہ ہونے دیا صرف اس لیے کہ دینِ اسلام کی سرفرازی اور اعلاء کلمۃ اللہ ہو، امر بالمعروف کی آواز دنیا کے ہر گوشے میں جا پہنچے اور نہی عن المنکر کا فریضہ منزلِ مقصود کو جا پہنچے۔ امتِ مسلمہ نے اس فریضہ سے انحراف کیا، دھک ہار کر گوشہ نشینی پر آمادہ ہو گئی تو ٹھیک اس کا وہی حشر ہوگا جو پچھلی ان قوموں جماعتوں کے ساتھ پیش آیا جن کے بارے میں قرآن کریم گویا ہے۔

"و اذ قالت امۃ منھم لم تعظون قوما ن اللہ مھلکھم او معذبھم عذاباً شدیداً قالوا معذرۃ الی ربکم و لعلھم یتقون فلما نسوا ما ذکروا بہ انجینا الذین ینھون عن السوء و اخذنا الذین ظلموا بعذاب بئیس بما کانوا یفسقون"

اور اس وقت کا حال پوچھئے جب ان میں سے ایک جماعت نے یوں کہا کہ تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے جاتے ہو جنکو اللہ تعالیٰ بالکل ہلاک کرنے والے ہیں یا ان کو سخت سزا دینے والے ہیں، انھوں نے جواب دیا کہ تمہارے رب کے روبرو عذر کرنے کے لیے اور اس لئے کہ شاید یہ ڈر جاویں۔ سو جب وہ اس امر کے تارک ہی رہے جو انکو سمجھایا جاتا تھا تو ہم نے ان لوگوں کو بچا لیا جو اس بری بات سے منع

کیا کرتے تھے اور ان لوگوں کو جو زیادتی کرتے تھے ایک سخت عذاب میں پکڑ لیا۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے وقت یہ بات ضرور مدنظر رہے کہ لہجہ انتہائی نرم اور انداز تکلم نہایت دلربا ہو کسی کی جانب سے سخت و ترش باتیں بھی سننی پڑیں تو خوش دلی سے گوارا کر لیا جائے سامعین اور مخاطب کی باتوں پر تکرار نہ کی جائے کیونکہ ہر بات پر زور دیں گی تو قربت کے بجائے بعد کی خلیج اور وسیع ہوتی جائے گی قرآن کریم میں ارشاد ہے۔

"خذ العفو وأمر بالعرف وأعرض عن الجاهلين" (الاعراف ۱۹۹)
درگزر کو قبول کر لیا کیجئے کام کی تعلیم کر دیا کیجئے اور جاہلوں سے ایک کنارہ ہو جایئے۔

دوسری جگہ ارشاد ربانی ہے۔

"ادع الى سبيل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتي هي احسن" النحل ۱۲۵
آپ اپنے رب کی راہ کی طرف علم کی باتوں اور اچھی نصیحتوں کے ذریعے بلایئے اور ان کے ساتھ اچھے طریقے سے بحث کیجئے۔

یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ انہیں اتنا پند و نصیحت نہ کیا جائے کہ وہ اکتا کر ساتھ ہی چھوڑ دینے پر آمادہ ہو جائیں بلکہ وقفہ میں ایسے لیے کوئی دن متعین ہو جس میں لوگ جمع ہو جائیں، عہد نبوی ﷺ میں یہی طریقہ رائج تھا۔

والدین پر بھی یہ ذمہ داری ہے کہ اپنے اہل و عیال کو برابر نیکیوں کا حکم دیں اور برائیوں سے روکیں، بچے کا پہلا مکتب والدین کا ماحول ہے وہ اسے جس قالب میں ڈھالیں اور جس رنگ میں رنگنا چاہیں رنگ دیں وہی ان کے حقیقی نگراں ہیں، دراصل عموماً بچے تمام برائیوں سے پاک ہوتے ہیں، والدین انہیں جدھر چاہیں پھیر سکتے ہیں حدیث شریف میں وارد ہے۔

"كل مولود يولد على الفطرة فابواه يهودانه او ينصرانه او يمجسانه"
بچے اپنی فطرت سلیمہ پر پیدا کئے گئے ہیں لیکن انکے والدین انہیں یہودی، نصرانی اور مجوسی بنا دیتے ہیں۔

والدین نے بچوں کو اسلامی تعلیمات اور دینی اداروں سے روشناس نہ کیا اور انہیں ثقافت اسلامی سے بیگانہ رکھا تو آخرت میں سخت باز پرس ہوگی قرآن کریم میں ارشاد ربانی ہے۔

"يا ايها الذين آمنوا قوا انفسكم واهليكم نارا" (التحریم ۶)
اے وہ لوگو جو ایمان لائے خود اپنے آپکو اور اپنے اہل کو آگ سے بچاؤ۔

شوہر پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنی بیوی کو بھی ان برائیوں سے دور رہنے اور نیکیوں سے قریب تر ہونے کی ترغیب دیتا رہے، اس نے اس کام میں تساہلی اور سہل انگاری کا ثبوت دیا اس کی سخت سزا بھگتنی پڑے گی کیونکہ وہی اس کا مختار کل ہے، وہی سب سے زیادہ مستحق ہے کہ اسے حرام و حلال سے آشنا کرے قرآن کریم میں ارشاد ہے۔

"الرجال قوامون على النساء بما فضل الله بعضهم على بعض" (۳۴ النساء)
مرد عورتوں پر حاکم ہیں اس سبب سے کہ اللہ نے بعضوں کو بعض پر فضیلت دی ہے۔

عورتیں کسی بات کو نہ مانیں، برائیوں پر اڑی رہیں تو انہیں پہلی بار ہر طرح سے سمجھا کر راہ راست پر لانے کی کوشش کی جائے اگر اس کے باوجود بھی ان پر کوئی اثر مرتب نہ ہو تو قرآن کہتا ہے۔

"واللاتي تخافون نشوزهن فعظوهن واهجروهن في المضاجع واضربوهن" ۳۴ النساء
اور جو عورتیں ایسی ہوں کہ تمہیں انکی بددماغی کا احتمال ہو تو انکو زبانی نصیحت کرو اور انکو انکی لیٹنے کی جگہوں میں اکیلے چھوڑ دو اور انکو مارو، مارنے میں یہ ضرور خیال رہے کہ کہیں ایسی جگہ نہ مارا جائے جس سے جان چلی جائے یا دائمی زخم کی صورت اختیار کر جائے۔

ان کے منہ پر بھی نہ مارا جائے ایک حدیث میں جو معاویہ بن حیدۃ القشیری سے مروی ہے وارد ہے کہ انہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا۔

بقیہ صفحہ ۴۳ پر

احسن اقبال
مظہر العلوم بنارس

عہد حاضر میں ہماری ذمہ داری

یہ بات کسی صاحب نظر سے مخفی نہیں ہے کہ دنیا میں جہاں کسی چیز کو کچھ لوگ چاہتے اور پسند کرتے ہیں، وہیں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اس سے سخت بیزار اور متنفر ہیں۔ اور ان دونوں قسم کے لوگوں میں تصادم و کشمکش کا ایک طویل سلسلہ ہے جو ابتداء آفرینش سے چلا آرہا ہے ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

حق و باطل کی یہ کشمکش روز ازل ہی سے برپا ہے۔ اس کشمکش میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ حق غالب آتا ہے اور باطل مغلوب ہو جاتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ باطل وقتی طور پر اقتدار قائم کر لیتا ہے اور حق کا سورج بادلوں میں روپوش ہو جاتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کی اور فرشتوں کو ان کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا حکم دیا، تو تمام فرشتوں نے خدا کے اس حکم کے آگے سر تسلیم خم کر دیا لیکن ابلیس نے ایسا کرنے سے اعراض کیا اور حکم خداوندی سے سرتابی کی۔ یہی نہیں بلکہ انسانوں کو بہکانے اور گمراہ کرنے کا بیڑا اٹھایا اور واضح طور پر اعلان کر دیا۔ چنانچہ شروع سے آج تک اس نے برابر اسلام کی مخالفت کی ہے اور انسانوں کو راہ راست سے ہٹا کر انھیں برابر ضلالت و گمراہی کے مہیب غار میں دھکیلتا رہا ہے۔ نتیجۃً تاریخ نے کبھی انسانیت کا ایسا تاریک دور دیکھا ہے کہ عقل دنگ ہو کر رہ جاتی ہے۔ یوں تو تاریخ کے بہت سے سیاہ اوراق ہیں لیکن عرب کی جاہلی زندگی اس میں سب سے نمایاں مقام رکھتی ہے۔

عرب کی اس جاہلی زندگی پر نظر ڈالیے تو آپ کو فتنہ و فساد، قتل و غارت، طبقاتی کشمکش، قبائلی تعصب، اور ظلم و جور کے رات دن پیش آنے والے واقعات کے ساتھ کفر و شرک اور بت پرستی و خدا بیزاری کی ایسی مکروہ اور گھناؤنی شکلیں نظر آئیں گی کہ جن کو دیکھ کر جبین انسانیت عرق آلود ہو جاتی ہے۔ اس زمانے کے انسان جہالت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ آپس کی دشمنی، مار پیٹ، قتل و غارت، نفرت و عداوت اور جنگ و جدال ان کے روز مرہ کے مشاغل تھے۔ باہمی جنگیں مسلسل جاری رہتیں۔ وہ کلی طور پر برائیوں کی آخری حدود تک پہنچ گئے تھے۔

ہمیشہ سے یہ خدا کی سنت رہی ہے کہ جب بھی باطل کی شر انگیزیاں اور اس کی برائیاں حد سے زیادہ بڑھتی ہیں تو اس نے اسے نیست و نابود کر کے دنیا کو اسلام کی روشنی سے منور کیا ہے۔ چنانچہ جب عرب کی برائیاں حد سے زیادہ بڑھ گئیں تو ان کا سد باب کرنے کیلئے اس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری پیغمبر کی حیثیت سے مبعوث کیا اور دنیا کی بڑھتی ہوئی برائیوں کا استیصال کیا۔ دنیا جو تباہی کے گڑھے کے کنارے کھڑی تھی اور عنقریب ہی اس میں گرنے والی تھی۔ اسے اس میں گرنے سے بچا لیا، اور اسے اسلام کے ذریعہ عزت و ترقی کے اونچے مقام تک پہونچایا۔ تاریخ نے جہاں انسانیت کا ایک ننگا اور عبرت انگیز باب دیکھا تھا، وہیں عہد نبوی کا ایک روشن

اور کافی غور دور بھی اس کی نظروں سے گذرا۔

اس وقت جب کہ دنیا میں ہر طرف ظلم و تشدد کا دور دورہ تھا۔ انسانیت نام کی کوئی چیز دنیا میں موجود نہ تھی۔ کفر و شرک کی گھٹا ٹوپ تاریکی چھائی ہوئی تھی دنیا راہ راست سے بھٹک کر ضلالت و گمراہی کے اتھاہ اور گہرے سمندر میں ڈوب چکی تھی ـــــ انسانیت کو راہ راست پر لانے کا کام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا۔ آپ آخری رسول تھے۔ آپ کے بعد اب کوئی نبی یا رسول نہ آئے گا اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دنیا کو سیدھی راہ پر لانے کی ذمہ داری امت مسلمہ پر عائد ہوتی ہے۔

اب آئیے ذرا حالات حاضرہ پر بھی ایک سرسری نظر ڈالتے چلیں۔ تاکہ اندازہ ہو جائے کہ ان حالات میں ہماری ذمہ داریاں کتنی بڑھ جاتی ہیں۔ یہ دور سائنس کا دور ہے آج سائنس اور ٹکنالوجی کی حیرت انگیز ترقیاں اپنے عروج پر ہیں انسان زمان و مکان کی حدود کو پامال کرتا نظر آرہا ہے۔ وہ خلاء بسیط سے نکل کر چاند پر قدم رکھ چکا، اور اب اس سے بھی آگے بڑھ کر مریخ پر بھی کمندیں ڈال رہا ہے۔ آج دنیا ترقی کی راہ پر بہت تیزی سے بھاگ رہی ہے، اس ترقی یافتہ عہد میں جب کہ تہذیب و تمدن اور علوم و سائنس کی روشنی سے ساری دنیا منور ہے ـــــ بہت کم لوگ ہیں جن کے ذہن اس حقیقت کی طرف متوجہ ہوتے ہوں گے کہ یہی عہد ظلمت و جہالت کے عروج اور انسانوں کی بدنصیبی اور ان کی بدبختی کا سیاہ ترین عہد بھی ہے۔ تاریخ میں عرب کے دور جاہلیت کو جو شہرت حاصل ہے۔ اس عہد کو مستقبل کی تاریخ میں شاید اس سے زیادہ شہرت حاصل ہوگی۔ عرب کا عہد جاہلیت بلاشبہ تاریخ کا تاریک ترین دور سمجھا جاتا ہے لیکن اگر چشم بصیرت سے دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ موجودہ دور اس سے کہیں زیادہ تاریک ہے عہد جاہلیت کے شکنجوں میں بری طرح جکڑا ہوا ہے سچ تو یہ ہے کہ زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس زمانے کی جاہلیت بھی ترقی یافتہ ہو چکی ہے یہ جاہلیت عرب کی جاہلیت سے زیادہ تاریک زیادہ گہری اور کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ یہ صحیح ہے کہ موجودہ جاہلی زندگی میں بت پرستی آج اس طرح رائج نہیں ہے لیکن یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ اس زندگی میں بندے اور خالق کا تعلق بڑی حد تک نہ صرف یہ کہ کمزور ہو گیا ہے بلکہ ٹوٹ گیا ہے۔ اور انسانیت نجاستوں اور ناپاکیوں سے اس طرح ملوث ہو چکی ہے کہ معصیت اور شرک کی بدترین شکلیں اس کی نظر میں دلفریب اور دیدہ زیب بن چکی ہے اور وہ بڑھ کر اس کا استقبال کرتی ہے۔

آج جب کہ دنیا میں ہر طرف لادینیت کا دور دورہ ہے انسانیت کو سیدھی راہ پر لانے کی ذمہ داری امت مسلمہ پر ہے، اسی امت پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ دنیا میں برائیوں کے سیل رواں کے آگے بند باندھے۔ اور دنیا کو اس کی تباہ کاریوں سے بچائے۔ لیکن بدقسمتی سے آج امت مسلمہ خود ہی زوال کا شکار ہے۔ اس نے اپنے اصل اور سچے راستے کو چھوڑ دیا ہے اور مغربی تہذیب کی طرف مائل ہو رہی ہے۔ وہ شرک و بدعت اور توہم پرستی میں مبتلا ہو چکی ہے۔ اس میں باہم تفرقہ پڑ گیا ہے۔ اور قرآن و حدیث اور ان کے احکام و فرائض کو پس پشت ڈال کر ہلاکت و تباہی کے بھیانک غار کی طرف بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کثرت تعداد اور مادی وسائل و ذرائع کی فراوانی کے باوجود آج نہ مسلمانوں کی کوئی وقعت ہے نہ کہیں ان کا وزن محسوس کیا جا رہا ہے۔ باطل کھل کر سامنے سے نہیں ہو کر میدان میں آچکا ہے اور ہمارا حال یہ ہے کہ یا تو خواب غفلت میں پڑے سوتے ہیں یا باہم دست و گریباں ہیں۔ آج ہم تباہی کے آتش فشاں کے دہانے پر کھڑے ہیں اور ہمارے اوپر ایک بہت نازک وقت آنے والا ہے۔ اجتماعی آلام و مصائب کا سامنا کرنے کیلئے جس اجتماعی شعور و بیداری اور کردار و عمل کی ضرورت

بقیہ صفحہ ۴۲ پر

شفیق طاہری

سب سے بڑا فن

دوپہر کی شدت سے سارا ماحول جل رہا تھا، گلی کوچے سنسان پڑے تھے، لوگ اپنے مکانوں دریچے بند کئے ہوئے بجلی کے پنکھوں کی ٹھنڈی ہوا اور فرحت بخش "مشروبات" سے لطف اندوز ہو رہے تھے، پرندے اپنے اپنے گھونسلوں میں دبکے ہوئے تھے، دھوپ کی تیزی سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آج سورج اپنی تمام تر توانائی خارج ہی کر کے دم لے گا۔

سائنسداں کافی دیر سے اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے چہرے کی لکیریں اس بات کی غمازی کر رہی تھیں کہ اس کے ذہن میں کوئی ایسی گتھی ہے جو سلجھائے نہیں سلجھ رہی ہے۔

نہ جانے کیا سوچ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ آنگن میں، نیم کا ایک گھنا درخت کھڑا ہوا تھا جو زمانے کے نہ جانے کتنے سرد و گرم موسموں سے آشنا تھا وہ اس کے ٹھنڈے سائے میں آ کر ٹھہر گیا اچانک اس کی نظریں درخت کی شاخوں کا مشاہدہ کرنے لگیں جیسے اسے کسی چیز کی تلاش ہو۔ درخت کی گھنی شاخوں میں سیکڑوں پرندے دھوپ اور لو سے بچنے کیلئے بسیرا لئے ہوئے تھے، اس گرم اور ہلاکت خیز ماحول میں ان بے زبان جانوروں کا یہی تو ایک سہارا تھا۔ ایک پتلی اور گھنی شاخ جو ذرا سی خمدار تھی اس میں ایک گھونسلہ نظر آیا جو گھاس اور پھولوں کے ریشوں سے پرندوں نے بڑے فنکارانہ انداز میں بنایا تھا، اچانک گھونسلے کے دہانے کے پاس ایک ہانپتا کانپتا پرندہ آکر بیٹھ گیا، اس کی ننھی سی چونچ میں ایک دانہ دبا ہوا تھا گھونسلے کے اندر بیٹھے ہوئے اس کے کئی بچے اس کی آہٹ سے چونکے اور اس پر بری طرح ٹوٹ پڑے جیسے کہ اسی کے منتظر ہوں، پرندہ باری باری اپنی چونچ بچوں کے منہ تک لے جاتا اور ہٹا لیتا اس طرح اس کے سارے بچے یکے بعد دیگرے اس کے پاس سے ہٹ گئے اور اپنی جگہ بیٹھ گئے، شاید پرندے نے گیہوں کے اس ایک دانے کو سارے بچوں میں تقسیم کر دیا تھا۔

سائنسداں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ سوچوں کی گہری لکیریں اس کی پیشانی پر ابھر آئیں وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا، وہ سوچ رہا تھا کہ —— ہم نے ذرہ توڑ کر حشر برپا کر دیا نہ جانے کتنے بے گناہ معصوم انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور فخر کیا کہ ہم نے بڑا کمال کر دیا ہے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے، ہم بڑے فنکار ہیں، تعلیمیافتہ ہیں، دنیا پر ہماری دھاک بیٹھ گئی۔ لیکن —— شاید یہ سب کچھ دھوکا ہے، فریب ہے، انسانیت کی تباہی کا سامان ہے۔ درحقیقت دانا توڑ کر زندگی برپا کرنا یہ سب سے بڑی سائنس، سب سے بڑا کمال، سب سے بڑا فن ہے۔

مجاہد الاسلام

علم جدید کا چیلنج اور مسلم طلبہ کی ذمہ داریاں

نوعِ انسانی کا ذہنی علم ہمیشہ ترقی کرتا رہتا ہے اور افکار و خیالات ہر دور اور ہر زمانہ میں ہمیشہ ہی رونما ہوتے رہتے ہیں۔ جس میں حق و باطل کی آمیزش ہوتی ہے۔ لہٰذا ہر دور اور ہر زمانہ میں ایسے افراد اور ایسے اشخاص کی ضرورت محسوس ہوتی رہی ہے۔ جو حق کو باطل سے الگ کر دیں۔ کھرے کو کھوٹے سے نکال دیں۔ اور کندن کو خام سے جدا کر دیں۔ نیز غلط افکار و خیالات اور غلط تصورات کی بخیہ گری کرتے ہوئے ان کی تردید کریں۔ اس کے مقابلہ میں صحیح اور موافق افکار و خیالات اور صحیح تصورات کو لوگوں کے سامنے پیش کریں۔

جیسے جیسے علم و فہم ترقی ہوتی گئی۔ لوگوں کے افکار و خیالات، احساسات و تصورات اور سوچنے سمجھنے کا انداز بھی بدلتا گیا۔ زمانہ قدیم میں منتشر افراد کو جوڑنے والا رابطہ مذہب ہوا کرتا تھا۔ جس کی وجہ سے لوگوں کا مرکز مذہب ہی تھا۔ خدا اور بندے کے درمیان حجاب بہت سے مصنوعی واسطے پڑ جاتے لیکن ان کا رب الارباب خدا ہی ہوا کرتا تھا مذہبی مزاج اس قدر عام تھا۔ اور خدا کا تصور اتنا چھایا ہوا تھا کہ جن حوصلہ مند لوگوں کو آمر مطلق بننا ہوتا تو وہ مذہبی انداز میں خدائی کا دعویٰ کرنے یا خدا سے اپنا کوئی مخصوص رشتہ لگانے پر مجبور ہوتے تھے۔ لوگ دیوی دیوتاؤں کی پوجا کرتے اور لو لگاتے تھے لیکن اب منتشر افراد کو جوڑنے والا رابطہ قومیت اور وطنیت وغیرہ ناموں سے موسوم ہے۔ زمانہ قدیم میں جو مقام خدا کے لئے مخصوص تھا اب قومیت اور وطنیت کو حاصل ہے۔ علامہ اقبال نے فرمایا تھا۔

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

گویا آج کا دور علمی اعتبار سے بہت ہی ترقی پذیر دور ہے۔ جس میں لوگوں کے رجحانات یکسر بدل گئے ہیں۔ قدیم تصورات کی جگہ اب نئے تصورات لوگوں کے ذہنوں پر چھا گئے ہیں۔

علمی ترقی کے کسی دور اور کسی زمانے میں اسلام کو ایسا زوردار اور خطرناک چیلنج کبھی نہیں کیا گیا۔ جیسا کہ اس

دور میں کیا جا رہا ہے۔ اس وقت فلسفی، ماہر تاریخ، ماہر معاشیات و اقتصادیات اور ماہر نفسیات سب مل کر اسلام کی جڑوں پر حملہ کر رہے ہیں۔ اسلام کی اصلی روح اور اس کی ساکھ کو بیخ سے ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ سوشلزم، کمیونزم، ڈیموکریسی، سیکولرزم وغیرہ وہ نظریات جن کی مقبولیت اس زمانے میں روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ اور جو نوع انسانی کے اعمال و افعال کو نہایت تیزی سے متاثر کر رہے ہیں۔ ہمارے مذہب کی بنیادوں کو غلط قرار دے گئے ہیں۔ اگر ہم ان نظریات کے علمی چیلنج کا کوئی موثر جواب نہ دیں۔ اور ان کی پر زور تردید نہ کریں۔ تو مسلمان کی حیثیت سے زندہ نہیں رہ سکتے۔ اور ان نظریات کا جواب دیتے ہوئے ہمیں اس بات کو بھی یاد رکھنا ہو گا۔ کہ اگر ہمارا جواب دور حاضر کے علمی معیاروں پر پورا نہ اتر سکے۔ اور اپنے استدلال کے حقائق سے دنیا بھر کے علماء اور حکماء کو مطمئن نہ کر سکے۔ تو ہرگز کوئی جواب نہ ہو گا۔ اور اس قسم کا جواب علمائے کرام نے ابھی تک نہیں دیا۔ کہاں ہیں وہ بڑے بڑے لوگ دین جن کو خدا نے مسلمانوں کی قیادت کے بلند مقام پر فائز کیا ہے اور جن کے نور ایمان اور زور قلم نے قرآن کی تفسیروں اور اسلامی کتابوں کے قابل قدر ذخیروں کا ڈھیر لگا دیا ہے۔ جو اسلام کے محافظ اور اس کے پاسبان ہیں۔ وہ کیوں اس خطرہ کو محسوس نہیں کرتے۔ افسوس کہ وہ علمائے دین جو کل تک اسلام اور کفر کی جنگ میں ہر محاذ پر اسلام کی مدافعت کے لئے پیش پیش رہتے تھے آج سو گئے۔

ایسی صورت میں اور ایسے زمانے میں یہ عظیم ذمہ داری ہمارے سروں پہ عائد ہوتی ہے۔ ہماری ذمہ داری اور ہمارا مقصد یہ ہے کہ دور حاضر کے غلط فلسفیانہ نظریات اور تصورات کا جو اسلام کو چیلنج کر رہے ہیں۔ تسلی بخش جواب دیں۔ لہٰذا ہمیں جدید فلسفیانہ تصورات کا علم و فہم اور جدید فلسفیانہ طرز استدلال کی واقفیت اور باطل نظریات کو سمجھنا ضروری ہے۔ کیونکہ یہ نظریات اور جدید فلسفیانہ تصورات مسلمانوں کے بنیادی عقیدہ تک کو متاثر کر رہے ہیں اور پورے علم و استدلال کے ساتھ اسلام کو زبردست نقصان پہنچا رہے ہیں۔ وہ اپنے رنگ میں اتنے دلفریب اور دلکش معلوم ہوتے ہیں کہ اچھے اچھے اہل نظر بھی ان کی خرابی کو محسوس نہیں کر پاتے اور ان کی تاویلیں کر کے ان کے ساتھ نباہ کرنے پر آمادہ اور تیار ہو جاتے ہیں۔ یہ خیالات صرف غیر ہی نہیں۔ بلکہ اس زمانہ میں بہت سے مسلمان ان پر اسی طرح سوچتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم سائنسی علوم مثلاً طبیعات، حیاتیات اور نفسیات سے واقفیت رکھیں۔ بالخصوص ان علوم کی ان ترقیوں کے جو اس بیسویں صدی میں رونما ہوئی ہیں۔ یہاں تک کہ ان فلسفیانہ تصورات اور نتائج کو سمجھ کر کام میں لا سکیں۔ اور ان کے فرق بیان کو سمجھ کر اپنی طرز تحریر کو معقولیت اور برجستگی کے سانچے میں ڈھال سکیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ ہمیں کتاب و سنت پر اتنی بصیرت ہو کہ اس کی روشنی میں ہم ان کے اعتراضات اور ان کے فلسفیانہ تصورات و خیالات کا جواب دے سکیں۔ ایک اور خصوصیت ہمارے لئے بے حد ضروری ہے۔ وہ اسلام سے سچی محبت اور اس کی ہمہ گیری جو تمام اخلاقی اور دینی پابندیوں کو قبول کرنا اور ان پر مستقل اور پوری ثابت قدمی سے عمل کرنا ہے اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ مسلمان خیر امت ہیں اور سب جانتے ہیں۔ کہ قوموں کے افراد کو جس چیز نے ایک امت اور ایک گروہ میں پیوست کر دیا ہے۔ وہ ان کا عقیدہ و ایمان ہے یہ عقیدہ یہ یقین ہی وہ بنیاد ہے۔ جس پر اسلامی تہذیب کا پورا محل کھڑا ہے یہ عقیدہ جتنا متزلزل اور ناقص ہو گا اتنا ہی یہ امت کمزور اور غلط کار ہو جائے گی۔ اور یہ عقیدہ جتنا مستحکم جاندار اور پختہ ہو گا۔ اتنی ہی یہ صحت مند ہو گی۔ اگر مندرجہ بالا تمام خوبیاں ہمارے اندر پیدا ہو جائیں تو یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ ہم جدید مسئلوں میں چیلنج کا جواب دے سکیں گے۔ مگر ضرورت اس بات کی ہے کہ ان صفات کو اپنے اندر پیدا کرنے کے لئے ہم ثابت قدمی اور عزم کے ساتھ کام لیں۔

محسنِ اعظم ﷺ

ابوالمجاہد زاہد

ثنا ہے ہادیِ اکرم رقم کی
بڑی تقدیر ہے میرے قلم کی

مری عشرت ہے، میری آبرو ہے
ثنا حسنِ اتم، نورِ حرم کی

عرب میں بھی اجالا ہے اسی کا
دکھاتا ہے روشنی صبحِ عجم کی

حیاتِ پاک ہے رحمت ہی رحمت
رسولِ عالم و شاہِ امم کی

گواہی دے رہی ہے "فتحِ مکہ"
رسول اللہ کے عفو و کرم کی

محبت کے فرائض میں ہے شامل
اطاعت بھی رسولِ محتشم کی

سلام اس محسنِ اعظم پہ زاہد
کہ جس نے دین و دنیا بھی بہم کی

(استاذ مرکزی درسگاہ
رام پور
(یوپی)

غزلیں

شفق طاہری

(۱)

آوارۂ کو بہ کو بہت ہے
اب شہر میں آبرو بہت ہے

یہ دھند یہ ریت یہ صحرا
اک بوند مرا لہو بہت ہے

دینار ہو کے ہوں تو اب تک
بازار میں آبرو بہت ہے

ملبوس حریر خوب لیکن
اے شوق غم رفو بہت ہے

افلاس نگاہ ہے یہ میرا
یا اب کے چمن میں لو بہت ہے

جنوں کو صلیب پہ سجا کر
اب زندگی سرخرو بہت ہے

اک عمر کی جستجو کا انعام
ناکامیٔ جستجو بہت ہے

اے ابر کرم برس کے کہنا
بنجر ہوں مگر نمو بہت ہے

دنیا کے فریب میں نہ آیا
ویسے تو شفق گرو بہت ہے

سید راشد علی حامدی

(۲)

گلشن سے بھی بہار کا منظر لیے ہوئے
اٹھ جاؤں نا قفس کو پروں پر لیے ہوئے

سو کے اٹھے ہیں جیسے ابھی خواب ناز سے
انگڑائیاں ہیں فتنۂ محشر لیے ہوئے

کیا جانے کتنے آئنے ہو جائیں چور چور
اب کے جنوں ہے ہاتھ میں پتھر لیے ہوئے

حیرت نہیں اگر میں سمندر ہوں پیاس کا
سورج کو مدتوں سے ہوں سر پر لیے ہوئے

رکھتے ہیں اپنی جان ہتھیلی پہ سرفروش
دیکھا ہے جب سے آپ کو خنجر لیے ہوئے

دنیا کو ایک طرفہ تماشہ سمجھ کے دیکھ
یہ آئنہ ہے سینکڑوں منظر لیے ہوئے

راشد خودی کے قتل کی ہم کو سزا ملی
پھرتے ہیں اپنی لاش کو در در لیے ہوئے

غزل

حفیظ میرٹھی

بڑے ادب سے غرورِ ستم گراں بولا
جب انقلاب کے لہجے میں بے زباں بولا

چمن میں سب کی زباں پہ تھی میری مظلومی
مرے خلاف جو بولا تو باغباں بولا

ابھی سے ہوش اڑے مصلحت پرستوں کے
ابھی میں بزم میں آیا، ابھی کہاں بولا

تلے ہیں قتل پہ پھولوں میں تولنے والے
یہ کیسا بول میں جھوٹوں کے درمیاں بولا

اثر ہوا تو یہ تقریر کا کمال نہیں
مرا خلوصِ مخاطب تھا میں کہاں بولا

کہا نہ تھا کہ نوازیں گے ہم حفیظ تجھے
اڑا گئے وہ مرے دامن کی دھجیاں بولا

نقد و تبصرہ

مولانا عبدالحکیم ایم اے

کھرے اور کھوٹے

۱۔ دعوت القرآن (تفسیر پارہ عم) از شمس پیرزادہ ، صفحات ۱۹۲، کتابت طباعت عمدہ ، قیمت [illegible] روپے

۲۔ جواہر الحدیث از شمس پیرزادہ صفحات ۱۹۲ ، کتابت وطباعت عمدہ ، قیمت [illegible] روپے

ملنے کا پتہ ۔ ادارہ دعوت القرآن ، ۵۹ محمد علی روڈ بمبئی نمبر ۴۰۰۰۰۳

محترم شمس پیرزادہ صاحب نے اس سے پہلے دعوت القرآن کی دو جلدیں پیش کی تھیں پہلی جلد سورۃ فاتحہ اور بقرہ پر مشتمل ہے اور دوسری جلد سورۃ آل عمران اور النساء پر۔ اب یہ تیسری جلد جو سورہ النباء تا سورۃ الناس پر مشتمل ہے ، طبع ہو کر آ گئی ہے ۔ کتابت وطباعت کا وہی بلند معیار برقرار رکھا گیا ہے جس کو دیکھتے ہوئے قیمتیں بہت کم ہیں ۔ مقصود یہی ہے کہ یہ کتابیں زیادہ سے زیادہ ہاتھوں تک پہونچائی جا سکیں

اپنی اس تفسیر میں انہوں نے جو اصول پیش نظر رکھے ہیں وہ انہیں کے الفاظ میں یہ ہیں ۔

تفسیر کی تالیف میں ہم نے عربی ، اردو ، انگریزی کی تقریباً تمام اہم تفسیروں کو پیش نظر رکھا ہے اور جا بجا ان کے حوالے بھی دیئے ہیں روایات کے سلسلہ میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے ۔ ہماری کوشش یہ رہی ہے کہ کوئی صحیح حدیث جو کسی آیت سے متعلق ہو چھوٹنے نہ پائے اور کوئی بھی کمزور حدیث اس میں جگہ حاصل نہ کرنے پائے روایات کے قبول کا معیار جہاں ہم نے بلند رکھا ہے وہاں روایات کا بھی پورا لحاظ کرنے کی کوشش کی ہے کہ تفسیر کے مقابلہ میں ذاتی رجحان اور شخصی ذوق راہ نہ پائے بلکہ جو بات بھی کہی جائے دلیل کی بنیاد پر کہی جائے اور یہ دیکھا جائے کہ نظم قرآن کس چیز کا متقاضی ہے اور سنت سے کیا رہنمائی ملتی ہے اس کے باوجود اگر کوئی غلطی ہوئی ہو تو وہ بہر حال اصلاح کے قابل ہے "

پوری تفسیر کا مطالعہ تو نہ ہو سکا لیکن جتنا پڑھا جا سکا اس سے مولف کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے ، زبان نہایت صاف ستھری اور آسان ہے ۔ معمولی پڑھے لکھے حضرات بھی دلچسپی کے ساتھ پڑھیں گے ۔

جواہر الحدیث

احادیث کے انتخاب میں محترم مولف نے بڑی دیدہ وری سے کام لیا ہے ترجمہ شستہ ، رفتہ اور دلنشین ہے تشریحات مختصر مگر موثر ہیں اور ان کے دل و دماغ پر دستک دیتی ہیں ۔ لاریب ان احادیث کا مطالعہ انسان کے اخلاق و کردار کو سنوارنے میں بہت مددگار ثابت ہو سکتا ہے ۔

ادارہ "حیات نو" ان دونوں کتابوں کے مطالعہ کی پرزور سفارش کرتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالی مولف کو اس سلسلہ کی دوسری کتابوں کی اشاعت کے عبلد از جلد مواقع بہم پہونچائے آمین !

محمد سمیع اختر

جامعہ کے لیل و نہار

تعزیتی جلسہ

مولانا ابوبکر صاحب اصلاحی کے انتقال پر ملال کی خبر وحشت اثر تو آپ کو مل ہی گئی ہوگی۔ مولانا مرحوم کا ایسے وقت میں انتقال کر جانا جب کہ جامعہ قحط الرجال کا شکار ہے، مرحوم کا انتقال ہم طلبہ ہی کے لئے نہیں بلکہ تمام ہی اساتذہ اور ذمہ داران جامعہ کے لئے دلی کرب واذیت کا سبب بنا۔ مرحوم پوری زندگی تعلیم و تعلم اور درس و تدریس میں مشغول رہے اور اپنے آخری ایام تک جامعہ میں تدریسی فرائض انجام دیتے رہے۔ مولانا مرحوم ایک مفسر قرآن ہی نہ تھے بلکہ آپ کو عربی ادب خصوصاً شعرائے جاہلی کے کلام پر گہری نظر تھی۔ غرضیکہ مولانا کی موت "موت العالم موت العالم" کے مکمل مصداق تھی۔

مولانا مرحوم کی یاد میں ایک تعزیتی جلسہ کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقعہ پر حسن اتفاق سے مرحوم کے داماد مولانا مستقیم احمد صاحب بھی تشریف لے آئے اس لئے سب سے پہلے موصوف ہی کو دعوت دی گئی کہ مولانا مرحوم کے بارے میں اظہار خیال کریں چنانچہ موصوف نے اختصار کے ساتھ مرحوم کی زندگی پر روشنی ڈالی، اور مولانا مرحوم کے زندگی کے کچھ ایسے کارناموں کی پردہ دری کی جن سے ہم لوگ تقریباً نا علم تھے۔ روزمرہ کے واقعات کی روشنی میں مولانا مرحوم کے مثالی طرز عمل، امانت و دیانت اور صبر و قناعت کو اجاگر کیا۔

اس کے بعد مولانا صغیر احسن صاحب اصلاحی استاذ جامعۃ الفلاح نے اپنے قریبی تعلقات و تجربات کی روشنی میں مولانا مرحوم کی زندگی کے درخشاں پہلوؤں کو اجاگر کیا اور مرحوم کی بے مثال جرأت و ہمت، صبر و تحمل اور عزم و ثبات پر روشنی ڈالی۔

اس پروگرام میں طلبہ نے بھی حصہ لیا اور مختلف انداز میں اپنے غم کا اظہار کیا آخر میں مولانا کے لئے دعائے مغفرت اور مرحوم کے پسماندگان کے لئے صبر جمیل کی دعا کی گئی۔

جناب حفیظ میرٹھی کے اعزاز میں

اسے ہماری خوش قسمتی ہی کہا جائے گا کہ ۱۱ مارچ کو حسن اتفاق سے جناب حفیظ میرٹھی صاحب جامعۃ الفلاح تشریف لائے تمام طلبہ نے پورے جوش و خروش سے موصوف کا استقبال کیا اور جب تک جامعہ میں رہے دیدہ و دل فرش راہ کئے رہے موصوف ایک مدت کے بعد جامعۃ الفلاح آئے تھے اس لئے طلبہ کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

یوں تو طلبہ نے غیر رسمی طور پر آپ سے خوب خوب کسب فیض کیا بعد نماز عصر جمعیۃ الطلبہ کی طرف سے عصرانہ بھی دیا گیا لیکن باقاعدہ طور پر آپ کے اعزاز میں ۱۲ مارچ کو بعد نماز عشاء ایک ادبی نشست کا انعقاد عمل میں آیا۔ جامعہ کے طلبہ و اساتذہ کے علاوہ قرب و جوار کے بہت سے لوگ شریک مجلس رہے، صدارت کے فرائض مولانا ابوبکر صاحب اصلاحی نے انجام دیئے اور کمپیئرنگ کی ذمہ داری برادر سید راشد علی حامدی نے سنبھالی، برادر موصوف نے صدر مجلس کی ایماء پر شعر و ادب میں مقصدیت اور اسلام کے موضوع پر ایک مختصر لیکن جامع تقریر کی دلکش انداز بیان، شستہ رفتہ زبان و بیان اور صوت و آہنگ دل موہ لینے والا تھا

موصوف نے قرآن و حدیث کی روشنی میں شعر و ادب کی اہمیت واضح کی اور اسے موجودہ دور میں تحریک اسلامی کے کاز کے لئے

بقیہ صفحہ ۴۴